قصرِ شیریں

عدم

ضربِ المثل رہے گا محبت میں میرا نام
آئیں گے میرے بعد فقط نوحہ خوانِ عشق

(حافظ محمد ولایت اللہ)

****



PDF By : Miskeen Mazhar Ali Khan

Cell NO : 00966590510687

Facebook Group «خاکۂ حلم» Link:

https://www.facebook.com/groups/1752899681599082/



میں شاعر اپنے فن کے ہوائے عروج پر ...
کیف و مستی، ماحول کے غلط نظریوں سے بیزاری ہے اور زندگی کے زیروبم کے بارے میں فن کارانہ اظہار رائے ہے۔

* نوائے وقت لاہور

قصر شیریں عدم کی ۱۶۴ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ عدم بنیادی طور پر ایک رند خرابات ہے۔ اور خمریات کا شاعر ہے۔ چھوٹی اور سبک بحروں میں وہ بڑے لطیف لب ولہجے اور حسین اسلوب میں غزل ادا کرتا ہے قصر شیریں کا دلکش سرورق مشہور مصور چغتائی نے تیار کیا ہے۔

* جنگ کراچی

عدم شراب و شاہد کا شاعر ہے۔ اسکا نظریہ حیات خواہ کچھ بھی ہو لیکن اردو کے موجودہ غزل گو شعراء میں اسکا ایک مقام ہے۔ خوب صورت الفاظ۔ چھوٹی چھوٹی بحریں نئی تراکیب اور سیدھا سادہ رواں انداز بیان اسکی خصوصیت ہے۔

* امروز کراچی

پاکستان بلکہ اردو زبان کے غزل گو شعراء میں عدم کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ زیادہ جامع الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدم کی شاعری بے اختیاری کی شاعری ہے۔ قصر شیریں میں دلکش اور بلند پایہ غزلوں کی بھی کمی نہیں۔ خمریات کے موضوع پر جو عدم کا خاص موضوع ہے بڑے پیارے شعر موجود ہیں۔

* کوہستان راولپنڈی

قصر شیریں مشہور شاعر عبدالحمید عدم کا مجموعہ کلام ہے۔ اس مجموعے میں غزلیں ہی غزلیں ہیں اور یہ غزلیں اپنے اندر ایسی چاشنی لئے ہوئے ہین کہ انکا ہر شعر خراج تحسین وصول کرتا ہے۔

قصرِ شیریں

سیّد عبدالحمید عدم



کتاب انسان کی بہترین دوست ہے

مکتبہ ماحول

آپ کے لئے معیاری، حیات افروز
اور خوبصورت کتابیں شائع کرتا ہے

کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں!
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا

سید عبد الحمید عدمؔ

ہاےےےےےےےےےےےے عدم

ناشر :۔۔۔۔۔ انور عارف مالک مکتبہ ماحول کراچی

طابع :۔۔۔۔۔ استقلال پریس مسلم مسجد انارکلی لاہور

دوسری بار　　　　فروری ۱۹۶۰ء

قیمت　　　　چار روپے

فہرس

میرے خیال و عمل میں کوئی تضاد نہیں
بس اس قدر کہ تمہیں خود پہ اعتماد نہیں

ترے ستم سے مرے دل کو ضعف پہنچا ہو
مجھے تو ایک بھی ایسی مثال یاد نہیں

میرا خلوص اندھیروں میں اور چمکے گا
یہ ضعفِ قلب تو ہے ضعفِ اعتقاد نہیں

سفینہ راں، کسی ترغیب میں نہ آجانا
مجھے تو بادِ موافق پہ اعتماد نہیں

تعلقات سے حذر ہے تو توڑ دو ان کو
خوشی کی بات ہے کوئی قرار داد نہیں

جناب شیخ کو شاید یہ حسنِ ظن ہے عدمؔ
بہشت میں کوئی ہنگامہ و فساد نہیں؟

اک داستاں میں محفلِ ہستی بکھر گئی
کیا مختصر سی رات تھی کیسے گذر گئی

مت پوچھ اضطرابِ جوانی کا مُدّعا
برسات کی ندی تھی کہ چڑھ کر اُتر گئی

بادل گھرے کہ رُوح میں ٹھنڈک سی آ گئی
ساغر اٹھا کے گردشِ شام و سحر گئی

ساقی یہ پُر فریب تبسّم تو زہر ہے
ساقی وہ پُر خلوص مسرّت کدھر گئی!

عمرِ رواں تلاشِ مسرّت میں اے عدمؔ
ایسے گئی کہ آپ بھی کمبخت مر گئی!

ہم اگر اعتبار کر لیتے
شب دے کو بہار کر لیتے

اُن سے دل کو بڑی محبت تھی
اُن کو تھوڑا سا پیار کر لیتے

التجا تم نے سن تو لی ہوتی
ہم ذرا اختصار کر لیتے

جانے والے پلٹ بھی آتے ہیں
یار کچھ انتظار کر لیتے

دوست اگر دوستی کے اہل نہ تھے
دشمنی اختیار کر لیتے

بات کچھ ایسی بے تسقع تھی
آپ بھی اعتبار کر لیتے

دل کا سودا عدم مذاق نہیں
بات تو استوار کر لیتے

سادہ لوحی کی خوشی کا یہ سماں ہوتا ہے
خواب میں جیسے کوئی چشمہ رواں ہوتا ہے

میں نے دیکھی ہے کناروں کی مروّت ساقی
مجھ کو طوفاں پہ کنارے کا گماں ہوتا ہے

مرے اخلاص کو بھی تم نے فسانہ سمجھا
ایسا اخلاص فسانوں میں کہاں ہوتا ہے

بھیگ جاتی ہے ترنّم میں جو مستی شب کی
میکدہ رُوح کا اس وقت جواں ہوتا ہے

جس طرح درد کا درمان وہ کرتے ہیں عدمؔ
اس طرح درد کا درمان کہاں ہوتا ہے

چھٹتے ہیں شاعری کی کتابیں ہیں پھول ہیں!
اربابِ عقل کس لئے ناحق ملول ہیں !!

اِک تیرے گیسوؤں کی دمک ایک موجِ مے
دو ہی تو زندگی کے درخشاں اصول ہیں

مجھ کو مرے خلوص کی کچھ داد چاہیئے !!
مجھ کو تمام حسنِ تصنع قبول ہیں !!

عقل نظر فریب کے پیچھے نہ جا سکے
اس راہ مختصر میں بڑے عرض و طول ہیں

بیٹھی ہے لیکے زندگی کیا دولتیں عدمؔ!
بربط ہیں، مغبچے ہیں، پیالے ہیں، پھول ہیں!

اُمید اِک حسین ترنم ہے دور کا
چشمے کے پاس پیڑ ہو جیسے کھجور کا

مجھکو بلاؤ گے تو تخاطب کو آؤ گے
میں معتقد نہیں ہوں روایاتِ طور کا

آتے ہیں مجھ سے پوچھنے لوگ آپ کا پتا
شاید یہ حادثہ بھی کرم ہے حضورؐ کا

کس درجہ سادہ لوح ہے نادان عقل بھی
احوال پوچھتی ہے جنوں کے امور کا

آواز اِس طرح تھی شکستِ اُمید کی
ہنگامۂ سکوت ہو جیسے قبور کا

کہتے ہیں جس کو ربطِ خرابات اے عدمؔ
اک معجزہ ہے تلخئِ فہم و شعور کا!

جہاں وہ زُلفِ برہم کارگر محسوس ہوتی ہے

وہاں ڈھلتی ہوئی ہر دوپہر محسوس ہوتی ہے

اجازت دے کہ تری کاکلوں کو ساتھ لے جاؤں

یہ شادابئ مرا زادِ سفر محسوس ہوتی ہے

ابھی تک میں نے پہچانا نہیں اس کی حقیقت کو

مجھے اپنی نظر تری نظر محسوس ہوتی ہے

ترا چہرہ کنول کی التجا معلوم ہوتا ہے

تری کاکل خماروں کی سحر محسوس ہوتی ہے

ہمارے دل کے آئینے میں عالم دیکھ لو اپنا

یہ رعنائی کہاں بارِ دگر محسوس ہوتی ہے

ذرا آگے چلو گے تو اضافہ علم میں ہوگا
محبت پہلے پہلے بے ضرر محسوس ہوتی ہے

خدارا زمزمہ چھیڑو کوئی گلشن کے رکھوالو
مجھے تو یہ خموشی نوحہ گر محسوس ہوتی ہے

ترے بیمار جب تنقید کرتے ہیں تری ضد پر
تجھے بھی کچھ ندامت چارہ گر محسوس ہوتی ہے

عدمؔ شادابیِ احساس وہ نایاب دولت ہے
جو اک معشوق کا فیضِ نظر محسوس ہوتی ہے

آؤ پیمانے اٹھائیں آؤ افسانے کہیں !
کس طرح گذرے پری زادوں سے یارانے کہیں

عقل بھی اک خبط اور وحشت بھی اک آشفتگی
کن کو فرزانے کہیں اب کن کو دیوانے کہیں

مہ جبیں پتھر بھی ہیں اخلاص کے چشمے بھی ہیں
اِنکو بت خانے کہیں یا ان کو میخانے کہیں

شاید اُن رنگیں خیالوں سے عبارت ہے بہشت
جن خیالوں کو ترے وحشی پری خانے کہیں

شمعیں روشن ہیں، مگر ماحول پھر بھی سرد ہے
وہ کہاں گُم ہو گئے ہیں جن کو پروانے کہیں

فصلِ گُل ہے، آئیے یوں بھی رہے اک دو گھڑی
ہم غزل کا ساز چھیڑیں، آپ افسانے کہیں

اے عدمؔ آنسو جو آنکھوں سے بہیں بے اختیار
ان کو الفت کے غریبانہ سے نذرانے کہیں !

غمِ زیست پر مسکرانا پڑا
ترے جبر کا گیت گانا پڑا

ارادہ تو نزدیک کا تھا مگر
بڑی دور تک ہم کو جانا پڑا

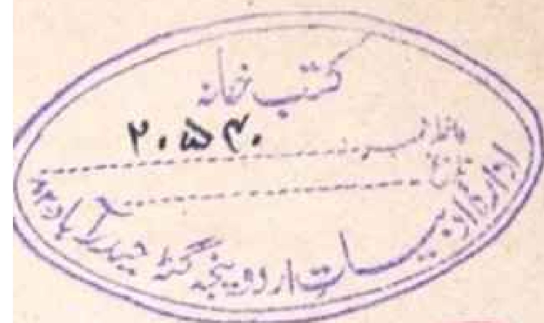
سمجھ کر تری آنکھ کا مدّعا
مشیت کو بھی لڑکھڑانا پڑا

کیا جب جوانی نے عزمِ سفر
محبّت کو رستہ دکھانا پڑا

خزاں کی جبیں اتنی تاریک تھی
بہاروں پہ ایماں لانا پڑا

بڑی دیر دامن بچاتے رہے
بہت جلد ساغر اُٹھانا پڑا

عدمؔ کتنے بے کیف ماحول میں!
ہمیں سازِ ہستی بجانا پڑا!



۲۲۷

دوست دل کے مسئلے میں میرے کام آئیں گے کیا
عقل کے تنکے جنوں کی رو کو ٹھہرائیں گے کیا

رنگ برہم بھی اگر ہوگا تو پھر بھی رنگ ہے
پھول مرجھائیں گے بھی تو پھول مرجھائیں گے کیا

پوچھتی ہے زندگی مفہوم اپنا بار بار!
آپ اک لمحہ مرے آغوش میں آئیں گے کیا

ابنِ آدم کا تجسس ہے نتیجہ کچھ بھی ہو !
دوستوں کے قحط سے دشمن بھی مرجائیں گے کیا

زندگی ہے کٹ ہی جائے گی کسی ترکیب سے
آپ اس بارے میں اب تکلیف فرمائیں گے کیا

صحبتِ ناجنس سے دل کو ملے گی کیا غذا
خلد میں تُو نے ہمیں بھیجا تو ہم کھائیں گے کیا

کشتیوں کی نیتیں خود بھی نہیں اتنی درست
ناخدا اس باب میں امداد فرمائیں گے کیا

دو تو قطرے ہیں صراحی میں تکلف بر طرف
یہ ہجومِ ہوش کو تسکین پہنچائیں گے کیا

پوچھتے ہیں ہم سے اہلِ ہوش مستی کا سبب!
ہم عدم خود ہی نہیں سمجھے تو سمجھائیں گے کیا

یہ عجیب چیز دیکھی یہ عجیب خواب دیکھا
ترے زانوؤں پہ اپنا سرِ اضطراب دیکھا

یہ دروغ کی حقیقت بھی ہوئی طلوع تم پر
یہ خلوص کا تغیر بھی مری جناب دیکھا

تری زلف کی گلی سے میں شبوں کو جب بھی گذرا
کہیں ماہتاب پایا کہیں آفتاب دیکھا

تری خوبیوں کا پیارے یہ حقیر سا بیاں ہے
تجھے بے نظیر پایا تجھے لاجواب دیکھا

عدمؔ اس نظر نے جب تک نہ کوئی مداخلت کی
نہ کوئی درست دیکھا نہ کوئی خراب دیکھا

بے نوشی کی ترغیبیں بھی ہوش کے جھوٹے حیلے ہیں
جن نینوں میں امرت ہے وہ نین بڑے ستھر میلے ہیں

اے گلچیں اِن کلیوں کو کچھ نشو و نما تو پانے دے
اِن کلیوں کے نازک نازک انگ بڑے لچکیلے ہیں

آؤ کہ اک دو راتوں کو بہکا کے یہیں گُم کر ڈالیں!
موسم گُل کے جام بکف ایّام بڑے بھرّ نیلے ہیں

دیکھنے والے ہوش میں رہنا سب دھوکا ہی دھوکہ ہے
جسم بڑے بدصورت ہیں ملبوس بڑے بھڑکیلے ہیں

شیخ و برہمن دونوں کی محشر میں عدمؔ یہ حالت ہے
اُن کے رنگ بھی پیلے ہیں اور ان کے رنگ بھی پیلے ہیں

خرد بھی خرابِ نظر ہو گئی
تری آنکھ بھی کارگر ہو گئی

روا تھا خدا کو بھی سجدہ مگر
جبیں آپ کا سنگِ در ہو گئی

شبِ غم کا کٹنا تو ممکن نہ تھا
مگر ہوتے ہوتے سحر ہو گئی

کوئی اور دل ڈھونڈیئے کا حضور
وہ بستی تو زیر و زبر ہو گئی

جہاں کہنے والے کو لغزش ہوئی
وہیں داستاں مختصر ہو گئی

عدم زندگی کی حکایت نہ پوچھ
نہ معلوم کیسے بسر ہو گئی

سحر کی دعا کا جواب آگیا
مرے ہاتھ میں آفتاب آگیا

شبو تو اُٹھا ہی لیا تھا مگر
تری انگھڑیوں سے حجاب آگیا

گھٹاؤں کے بننے میں دقت ہی کیا
وہ گیسو کھلے اور سحاب آگیا

وہ پہلے ہی تصویر سے کم نہ تھے
مگر اب تو عہدِ شباب آگیا

اسے بھی ضرورت تھی اک جام کی
عدمؔ بھی مرے ہم رکاب آگیا!

یہ بھی چھلنی وہ بھی چھاج
تیاگ دیے سب رسم و رواج

آجاتے ہیں سمجھانے!
مردودوں کو کام نہ کاج

صبح قیامت جلد نکل
پوچھتے ہیں وہ میرا مزاج

دنیا میں دو صدمے ہیں
ایک محبّت ایک سماج

وقت نہ کھو بے سود عدمؔ
کل کی بابت سوچ نہ آج

ہم اہلِ دل بھی ترا اہتمام دیکھیں گے
کہاں پہنچتی ہے قندیلِ جام دیکھیں گے

ہے کتنا فاصلہ تیری گلی سے محشر تک
ہم آپ چل کے ذرا چند گام دیکھیں گے

سزائے دار بھی ہو گر صلا تماشے کا
مدام دیکھنے والے مدام دیکھیں گے

ترے جمال کو دیکھے گا کون ان کے سوا
ترے جمال کو تیرے غلام دیکھیں گے

عدمؔ بلا سے نگاہوں پہ برق کیوں نہ گرے
ہم ایک بار تو بالائے بام دیکھیں گے

فسانے نہ بے سود تصنیف فرما
اگر ہو سکے دل کی تالیف فرما

کہیں مر نہ جائیں ستم سہنے والے
تغافل میں تھوڑی سی تخفیف فرما

پریشاں نہ ہو جائے تنظیمِ ہستی
مری جان اتنی نہ تکلیف فرما

گھڑی دو گھڑی کا تماشا ہے دنیا
گھڑی دو گھڑی اور تشریف فرما

عدمؔ جام میں ذہن کو غسل دے کر
ذرا چشمِ ساقی کی تعریف فرما

ہم جو نقصانِ جاں کرتے ہیں
آپ کا کیا زیاں کرتے ہیں

وہ بھی کرتے ہیں آزمائش کچھ
ہم بھی کچھ امتحاں کرتے ہیں

دشمنی غیر تو نہیں کرتے
دشمنی مہرباں کرتے ہیں

مجھکو تشہیر اس لئے ہے عزیز
یہ کرم رازداں کرتے ہیں

جانے کیوں لوگ رہزنوں پہ عدمؔ
رہبروں کا گماں کرتے ہیں !

موت مجھے پہچان گئی
زیست مرے قربان گئی

ہولے ہولے وصل ہوا
دھیرے دھیرے جان گئی

دیر و حرم اور آگاہی
کس جانب نادان گئی

عزت ہے تو سب کچھ ہے
آن گئی تو جان گئی

عقل بھی کیا ناداں تھی عدمؔ
میرا کہنا مان گئی

ہم بھی کتنے خبط الپسند ہوئے

زندگی کے نیاز مند ہوئے

کاش یا رب قفس ہی وا ہوتا

کب چمن کے کواڑ بند ہوئے

ہم نے تجویز بیش کی تھی فقط

آپ کیوں اُس پہ کاربند ہوئے

وہ تبسم جو قیمتی تھے بہت

آخر کار زہر خند ہوئے

کیا خرابی ہے بے خودی میں عدمؔ!

کیا کریں گے جو ہوشمند ہوئے؟

چمن شوق کا لالہ گوں ہو گیا ہے

جواں آرزوؤں کا خوں ہو گیا ہے

یہی سوچ رہتی ہے اہلِ خرد کو

یہ کیا ہو گیا ہے یہ کیوں ہو گیا ہے!

وہاں ایک ننھی سی مشعل جلا دو

جہاں بھی اندھیرا فزوں ہو گیا ہے!

سمجھ میں نہیں آ رہی تھی عبارت

یہ مطلب تھا؟ اچھا تو یوں ہو گیا ہے

عدمؔ انتہا ہے یہ فرزانگی کی!

کہ اہلِ خرد کو جنوں ہو گیا ہے!

رو میں آؤ تو کوئی بات بنے
جام اٹھاؤ تو کوئی بات بنے

اُن کو عادت نہیں توجّہ کی
لڑکھڑاؤ تو کوئی بات بنے

لوگ مشتاق ہیں قیامت کے
حشر ڈھاؤ تو کوئی بات بنے

مضمحل ہے بہار کا موسم
مسکراؤ تو کوئی بات بنے

مے کا اب کیا عدمؔ اثر ہوگا!
زہر کھاؤ تو کوئی بات بنے!

نظر اُس نے جب برملا ڈال دی
مری زندگی کی بِنا ڈال دی

فضا اس قدر تو گلابی نہ تھی
یہ کِس گلبدن نے حِنا ڈال دی

میں ممنون ہوں اے غمِ زندگی
مرے جام میں چیز کیا ڈال دی

مرے ہاتھ میں خطِ دل کی جگہ
محبت نے رسمِ وفا ڈال دی

عدمؔ کس نگاہِ خوش آہنگ نے !
شکستہ دلوں میں صدا ڈال دی !

ہم دیوانے صبح سویرے جام اُچھالا کرتے ہیں
کس اُلفت سے پیرِ مغاں کا نام اُچھالا کرتے ہیں

موسم گل میں اس کے سوا کیا کام فراست والوں کا
رنگ بکھیرا کرتے ہیں یا جام اُچھالا کرتے ہیں

یہ بے پروا میکش جو باغی ہیں بھرے پیمانوں سے
بعض اوقات تہی خم کو بھی عام اُچھالا کرتے ہیں

موسم کی بے کیفی میں جب رنگِ بہاراں بھرنا ہو
ہم زلفِ نگاراں کے سائے میں جام اُچھالا کرتے ہیں

اُڑتے پرندوں کو کرنا ہو جب لہرا کر صیدِ عدمؔ
کس چھب سے صیاد گھنیرے دام اُچھالا کرتے ہیں

٭

دے جام میں بھر کر آگ کہ میکش بزم سے اٹھنے والے ہیں
گا کوئی دل افگن راگ کہ میکش بزم سے اٹھنے والے ہیں

کیوں نیند سے گرتا جاتا ہے، باقی ہے بہت سی رات ابھی
بدقسمت ساقی جاگ کہ میکش بزم سے اٹھنے والے ہیں

اک مرتبہ پھر انگڑائی کہ مدہوشی میں کمی ہے تھوڑی سی
اک مرتبہ پھر بہاگ کہ میکش بزم سے اٹھنے والے ہیں

ساقی یہ لپیٹ اور لاگ تو سب محدود ہے دورِ محفل تک
اب کیسی لپیٹ اور لاگ کہ میکش بزم سے اٹھنے والے ہیں

اب پاؤں عدم اور ہستی کی سرحد پہ ہے بادہ خواروں کا
کھول آخری خم کا کاگ کہ میکش بزم سے اٹھنے والے ہیں

عالمِ بے خودی نہیں علم و خبر کا رنگ ہے

میری نظر کا رنگ بھی تیری نظر کا رنگ ہے

کتنی حلاوتیں لئے سیر کو جا رہے ہیں وہ

زلف میں شب کی اوس ہے، رخ پہ سحر کا رنگ ہے

دل ہے کہ ہے حیات کا چاند سیاہ رات کا

عقل گہر کی آب ہے عشق گہر کا رنگ ہے

دو ہی تو زادِ راہ ہیں منزلِ یار کے لئے

پیاس سفر کی جان ہے شوق سفر کا رنگ ہے

ایک سلیقۂ جنوں اس کے بغیر اے عدمؔ

نہ کوئی گھر کا ڈھنگ ہے نہ کوئی در کا رنگ ہے

مضبوطیٔ دل کا دعویٰ کا تھا ـــــ مضبوطیٔ دل کافور ہوئی

پندارِ جنوں محجوب ہوا ـــــ رفتارِ خرد رنجور ہوئی

خیر ایک نتیجہ تو نکلا ـــــ تفریحِ محبت کرنے کا

کچھ دل کی طبیعت صاف ہوئی ـــ کچھ سر کی گرانی دور ہوئی

احساس کی جلتی گرمی نے ـــــ ادراک کو یوں شاداب کیا

تھوڑی سی جو ٹھنڈک تھی دل میں ـــ وہ ٹھنڈک بھی کافور ہوئی

ہم بادہ کشوں نے اے ساقی ـــ کیا بادہ کشی سے اخذ کیا

کچھ خلق ترا بدنام ہوا ـــ کچھ آنکھ تری مشہور ہوئی

یہ پچھلے پہر کا سناٹا ـــ یہ مست ستاروں کے جھرمٹ

کس وقت عدمؔ وہ یاد آئے ـــ کس وقت صراحی چور ہوئی

بھولی بسری باتوں سے کیا تسکیں روداد کریں
ہم کو تو کچھ یاد نہیں ہے آپ ہی کچھ ارشاد کریں

کیسی محبّت کیسی چاہت ہم پر سب کچھ روشن تھا
یونہی ذرا یہ شوق ہوا تھا آؤ دل برباد کریں

عشق نے سونپا ہے کام اپنا اب تو نبھانا ہی ہوگا
میں بھی کچھ کوشش کرتا ہوں آپ بھی کچھ امداد کریں

جیب و گریباں سوئے سوئے باغ و گلستاں سونے سے
بیٹھا ہے بیکار جنوں سرکار کوئی ارشاد کریں

حُسن کی دولت رکھنے والے کتنے بے پرواہیں علامؔ
ناز سے فرماتے ہیں ہنس ہنس کس کو برباد کریں!

کس قدر مجبور ہوں میں کس قدر مختار ہوں
دامِ ہستی میں ادائے التفاتِ یار ہوں

میں فقط حسنِ تکلم ہی سے زخمی ہو گیا
زندگی اک روز کہہ بیٹھی تھی میں تلوار ہوں

کاش ڈھل جاؤں تری خاطر کسی ترتیب میں
یوں تو اک بکھرا ہوا مجموعۂ افکار ہوں

آج اتنی اجنبیت مت برتئے گا حضور!
آج میں ہر ہر جگہ پر آمادۂ تکرار ہوں

زندگی سے پیار کرنا گر مرض ہے اے عدمؔ
پھر تو یہ کہئے کہ میں ایک مستقل بیمار ہوں

جاں ہوئی محرومِ جاں، قلبِ جواں مارا گیا

اتفاقاً کارواں کا کارواں مارا گیا

رہبر و رہزن یہی دو آفتیں تھیں راہ کی

راہ رَو دو آفتوں کے درمیان مارا گیا

دل پہ وارد تو ہوئے تھے راہ میں کچھ حادثے

یہ نہیں معلوم بیچارہ کہاں مارا گیا

آپ ہی دریافت کیجئے اب محلِ مرگِ دل!

یا یہاں مارا گیا ہے یا وہاں مارا گیا

ڈھونڈتی ہیں اب عدمؔ کو ان کی لطف آرائیاں

جن کی پیہم غفلتوں سے وہ جواں مارا گیا

کبھی اس طرف بھی پیارے سرِ شام بے ارادہ

نکل آ کہ چند لمحیں پہ چلے جام بے ارادہ

وہ عجیب قدرتی سی رہ و رسمِ واقفیت

وہ سلام بے ارادہ، وہ پیام بے ارادہ

مری اک صفت خدا کو یہ بہت پسند آئی

مری بخش دیں لغزشیں وہ تمام بے ارادہ

ادب اور عقل و دانش کا یہی ہے فیصلہ اب

کبھی تجھ سے ہو تصادم سرِ عام بے ارادہ

ذرا دیکھنا عدمؔ کو ابھی آ کے یہ کہے گا

ادھر آ گیا تھا آقا یہ غلام بے ارادہ

فرصت کے سہانے لمحوں میں کیا کام کی باتیں ہوتی ہیں
کچھ یار کا قصہ ہوتا ہے کچھ جام کی باتیں ہوتی ہیں !

اے دوست تبسّم کی لہریں ہونٹوں پہ کہاں سے اب لاؤں
حالات کے میلے ہوتے ہیں ایّام کی باتیں ہوتی ہیں

اربابِ خرد کی محفل میں دل اور پریشاں ہوتا ہے
کچھ سوزن کے دقفے ہوتے ہیں کچھ کام کی باتیں ہوتی ہیں

آلامِ زمانہ فرصت دیں تو بیٹھ کے دل کا حال کہیں
اُس زُلفِ مسلسل کی باتیں، آرام کی باتیں ہوتی ہیں

جس وقت عدمؔ دل دُنیا کے افکار سے خالی ہوتا ہے
اُس وقت جو باتیں ہوتی ہیں، الہام کی باتیں ہوتی ہیں

بیتے ہوئے دنوں کی کوئی بات چھیڑ دے
زلفیں بکھیر اور حکایات چھیڑ دے

غم ہائے روزگار کی نیّت خراب ہے
انگڑائی لے کے سازِ خرابات چھیڑ دے

ایسی کمند پھینک جو رحمت کو کھینچ لائے
ایسی نگاہ ڈال جو برسات چھیڑ دے

مدّت ہوئی ہے رقصِ عقیدت کئے ہوئے
پھر کوئی رنگ بارِ مناجات چھیڑ دے

کٹتی ہے زندگی انہی حیلوں سے اے عدمؔ
بیٹھا ہے کیوں خموش کوئی بات چھیڑ دے

کیا شکلِ واقعات خرابات میں ملی
کھوئی ہوئی حیات خرابات میں ملی

جس رات ہم اور آپ تھے مصروفِ گفتگو
کونین کو وہ رات خرابات میں ملی

پہلے تو وہ بھی ہوش میں تھے ہم بھی ہوش میں
راہِ تعلقات خرابات میں ملی

ہم نے خدا کی ذات کو ڈھونڈا تھا ہوش میں
ہم کو خدا کی ذات خرابات میں ملی!

کیا باخرد سے لوگ تھے مصروفِ مے کشی
کیا اجنبی سی بات خرابات میں ملی

بے گانگی کی صبح تو تھی ہر جگہ عدمؔ
ہمسائیگی کی رات خرابات میں ملی

اُن انکھڑیوں میں آج جو مفہومِ یاس ہے
محسوس ہو رہا ہے مشیّت اُداس ہے

اے موسمِ بہار تو لے جا اسے کبھی ساتھ
میرا شباب بھی ترے پھولوں کی باس ہے

خوشبو اُڑی ہے رنگ کے سینے کو چیر کر
کہتے ہیں جس کو گل وہ جنوں کا لباس ہے!

میں بھی حرم نشیں ہوں مگر اتفاق سے!
مجھ کو ہوائے دیر بھی تھوڑی سی راس ہے

آسودہ ہو گی کیا مری بے تابیٔ دوام
دِل ایک تشنگی ہے، نظر ایک پیاس ہے

مَے ہو کہ زہر کچھ تو میسّر ہو اے عدمؔ
حَد سے فزوں جراحتِ ہوش و حواس ہے

وقت اُس حسین کے پاس کچھ اتنا قلیل تھا
قصہ اِک آہ میں بھی سمٹ کر طویل تھا

باہوش دل ہزار قلق کا ہے آئینہ
نادان دل ہزار خوشی کا کفیل تھا

میں میکدے کی راہ سے ہو کر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا کتنا طویل تھا

کلیوں کو سونگھ سونگھ کے زندہ رہا جنوں
موسم شب بہار کا کتنا علیل تھا

ہلکے سے اختلاف سے راہیں بدل گئیں
تھوڑا سا فاصلہ تھا مگر کیا طویل تھا

اُس کے بغیر بھی تو عدم کٹ گئی حیات
اُس کا خیال اُس سے زیادہ جمیل تھا

ہے کس کا انتظار مجھے کچھ خبر نہیں
کب آئے گی بہار مجھے کچھ خبر نہیں

میں دیکھتا ہوں تم کو یونہی بر سبیلِ شوق
کہتے ہیں کس کو پیار مجھے کچھ خبر نہیں

تیری نگاہ - میری محبت - کہ زندگی
ہے کون مے گسار مجھے کچھ خبر نہیں

آواز کس نے دی تھی تجھے فرطِ شوق سے
اے دُخترِ بہار مجھے کچھ خبر نہیں

جاتی ہے کس حسین کی منزل کو اے عدم
ہستی کی رہگذار مجھے کچھ خبر نہیں

توبہ کا تکلف کون کرے حالات کی نیّت ٹھیک نہیں

رحمت کا ارادہ بگڑا ہے برسات کی نیت ٹھیک نہیں

اے شمع بچانا دامن کو عصمت سے محبت ارزاں ہے

آلودہ نظر پروانوں کے جذبات کی نیت ٹھیک نہیں

کل قطع تعلق کر لینا، اس وقت تو دنیا میری ہے

یہ رات کی قسمیں جھوٹی ہیں یہ رات کی نیت ٹھیک نہیں

ڈرتا ہوں عدمؔ پھر آج کہیں شعلہ نہ اٹھے بجلی نہ گرے

بربط کی طبیعت الجھی ہے نغمات کی نیّت ٹھیک نہیں

جورِ خلاق کی تفریح کا ساماں ہونا

کسقدر مضحکہ انگیز ہے انساں ہونا

بات قائم ہے فقط ایک توانا ضد سے

میرا انساں کہ ترا خالقِ انساں ہونا

تیرے ابرو کا اشارا ہو کہ ہو نوکِ ہلال

بارِ اوّل بڑا مشکل ہے نمایاں ہونا

زندگی ہے سو بہر حال گذر جائے گی

کس لئے آپ کا شرمندۂ احساں ہونا

عقل ہر بات کو اک جرم بنا دیتی ہے

بے سبب سوچنا بے سُود پشیماں ہونا

آؤ سو جائیں خزاں آنے سے پہلے اک رات
کون دیکھیگا بہاروں کا پریشاں ہونا

غنچہ اس معنیٔ رنگیں کا اشارا نکلا
نشۂ حسن کی تکمیل سے عریاں ہونا

بعض راتوں کو عدمؔ ہوتا ہے محسوس مجھے
اتنا مشکل بھی نہیں گھر کا بیاباں ہونا

رات اُس زلفِ پریشاں میں کوئی پھول نہ تھا

حادثہ ہے کہ گلستاں میں کوئی پھول نہ تھا

میں نے دیکھی ہے بگولوں میں جوانی اُن کی

لوگ کہتے ہیں بیاباں میں کوئی پھول نہ تھا

آپ جب صبحِ ازل مجھ کو ملے تھے ہنس کر

کیا مرے چاکِ گریباں میں کوئی پھول نہ تھا

میں نے پوچھا تھا کھلینگے یہاں کب تک غنچے

میں نے دیکھا تو گلستاں میں کوئی پھول نہ تھا

اُس کی آنکھوں نے عدمؔ رکھ لیا پردہ ورنہ

دامنِ فصلِ بہاراں میں کوئی پھول نہ تھا

رات جب چاند سے مصروفِ سخن ہوتی ہے
میرے دل میں تری پلکوں کی چبھن ہوتی ہے

میرے آنسو کا بھی ہے تیرے لبوں سے رشتہ
شبنم و غنچہ سے ترتیبِ چمن ہوتی ہے

کیا نئی بات ہے نکلا جو صدف سے گوہر
ہر اندھیرے میں نہاں ایک کرن ہوتی ہے

جن سے بے لوث محبت کا ہو رشتہ قائم
اُن سے رنجش بھی بجا صاحبِ من ہوتی ہے

گو ختنِ مُشک کے بارے میں ہے مشہور عدمؔ !
پر ختن میں بھی کہاں مشکِ ختن ہوتی ہے !

مشکل یہ آپڑی ہے کہ گردش میں جام ہے
اے ہوش ورنہ مجھکو ترا احترام ہے

فرصت کا وقت ڈھونڈ کے ملنا کبھی اجل
مجھکو بھی کام ہے ابھی تجھ کو بھی کام ہے

آتی بہت قریب سے خوشبو ہے یار کی
جاری ادھر ادھر ہی کہیں دورِ جام ہے

اے زلفِ عنبریں ذرا لہرا کے پھیلنا
اک رات اس چمن میں بھی میرا قیام ہے

میں ہی نہیں ہوا اس کی تلخی سے جاں بلب
میرا مشاہدہ ہے یہ تکلیف عام ہے

مے اور حرام حضرتِ زاہد خدا کا خوف
وہ تو کہا گیا تھا کہ مستی حرام ہے

اے زندگی تو آپ ہی چپکے سے دیکھ لے
جامِ عدم پہ لکھا ہوا کس کا نام ہے

ہم تری بات کے اسلوب کو پہچانتے ہیں

زشت کو جانتے ہیں، خوب کو پہچانتے ہیں

آپ اب اتنا تجاہل بھی نہ برتیں صاحب

آپ اس بندۂ معتوب کو پہچانتے ہیں

عشق اک اندھی عقیدت ہے وہ جس سے ہو جائے

کتنے عاشق ہیں جو محبوب کو پہچانتے ہیں

اے غمِ زیست بہت سادہ و معصوم نہ بن

ہم تری صورتِ معتوب کو پہچانتے ہیں

ہم کو پہچانا تو پہچانا محبت نے علامؔ!

یار مجذوب ہی مجذوب کو پہچانتے ہیں

ستارے میکشوں کو جانتے ہیں
یہ اُن لوگوں کو سورج مانتے ہیں

بڑے سلجھے ہوئے انسان ہیں یہ
مشیّت کے ارادے جانتے ہیں

یہ وہ انسان ہیں جو زندگی کو!
بہت اچھی طرح پہچانتے ہیں

خیالوں میں زمانے تولتے ہیں
نگاہوں میں شرابیں چھانتے ہیں

ہماری خوبیوں کو کچھ منافق
ابھی تک خامیاں گردانتے ہیں

اِدھر آجائیے سرکار، میکش
شرابی چال کو پہچانتے ہیں

عدمؔ کے مذہبی قائل نہیں ہیں
عدمؔ کو صوفیا تک مانتے ہیں

گھر میں شبنم کے جو خورشید کی مہمانی ہے
ظرفِ ہر قطرہ میں سو بحر کی طغیانی ہے!

واں وہی رسمِ تغافل کا ستم ہے جاری
یاں وہی حسنِ عقیدت کی فراوانی ہے!

دیکھ لو شمع پہ گرتے ہوئے پروانے کو
یہ مرے شعلۂ احساس کی عریانی ہے!

آنکھ کو مے میں ڈبو لوں تو کروں جراَتِ دید
مہ جبینوں کے رخوں پر بڑی تابانی ہے

چاٹ کچھ ایسی ستم گر کو پڑی ہے کہ عدمؔ!
شیخ ہے اور درِ میخانہ کی دربانی ہے!

خلوصِ دوستاں کم ہو گیا ہے
تکلف کا زیاں کم ہو گیا ہے

مسافر اور اتنے بے اثاثہ!
تپاکِ رہبراں کم ہو گیا ہے

کہاں ہیں موسمِ گُل کے مغنّی!
خروشِ بوستاں کم ہو گیا ہے

حجاب اتنے پڑے ہیں درمیاں میں
حجابِ درمیاں کم ہو گیا ہے

گلستاں کی بہاریں تو وہی ہیں
ہمارا آشیاں کم ہو گیا ہے

کہانی ہو بہو میری نہیں ہے
کوئی حرفِ بیاں کم ہو گیا ہے

عدم بدلی ہے ان کی آنکھ ایسے
غریبوں کا جہاں کم ہو گیا ہے

صحنِ گلشن میں جو بے رنگ ورق ملتا ہے

اُس کی صورت سے بصیرت کا سبق ملتا ہے

کشتیِ زیست کا احوال تو معلوم نہیں

صرف اک شور سا نزدیکِ اُفق ملتا ہے

صرف ہم ہی نہیں اس شوخ کے رستے میں خراب

سینۂ عالمِ تحقیق بھی شق ملتا ہے

آپ کی کاکلِ برہم کا نہیں کچھ شکوہ

ہم کو جو کام بھی ملتا ہے ادق ملتا ہے

ماجرا کیا ہے کہ آغاز بہاراں میں عدمؔ

رنگ ہر غنچۂ دیگر کا فق ملتا ہے

زندگی رنگ و خد و خال کی دیوار نہیں
آدمی رونقِ بازار ہے بازار نہیں

گو خموشی نہیں مانوسِ تکلم پھر بھی
اس سے بہتر کوئی پیرایۂ اظہار نہیں

سوچ لو راہ میں مجھ کو نہ پریشاں کرنا
راستہ زیست کا کہتے ہیں کہ ہموار نہیں

ایک ہی بار کنارے پہ لگے گی جا کر!
ناؤ وہ ناؤ کہ ساحل کی طلبگار نہیں!

اس کی تیزی سے دہن جل نہیں سکتا ساقی
جام میں مے ہے ترا شعلۂ رخسار نہیں

چارہ سازوں کی تکالیف کی کوئی حد ہے
مجھکو محسوس یہ ہوتا ہے میں بیمار نہیں

صرف میخانہ ہی وہ کُنج سہولت ہے جہاں
زندگی کی کوئی پیچیدگی دشوار نہیں

ساقیا میری عقیدت کو نہ دھوکا دینا
میں تری آنکھ کی نیت سے خبردار نہیں

تیرے اندازِ تغزل میں وہ بجلی ہے عدمؔ
جو کسی دوسرے محمل میں شرربار نہیں!

دوستی آج ضمیروں پہ اُتر آئی ہے
بات فرسودہ لکیروں پہ اُتر آتی ہے

اِک سبو پھر کسی ایمان سے ٹکرایا ہے
اِک کتاب اور فقیروں پہ اُتر آتی ہے

کتنے اخلاص سے سجاگی ہیں تجھی ترغیبیں
کس قدر تازگی تیروں پہ اُتر آئی ہے

کون اس لُطفِ گراں وزن کا حامل ہو گا
چاندنی رات اسیروں پہ اُتر آئی ہے

تجھ کو اخلاص کی تعزیر جو ملنی تھی عدمؔ
میرے بدبخت مشیروں پہ اتر آئی ہے

اس طرح عہدِ بہار آ کے گذر جاتا ہے

جس طرح رنگ کھلونوں کا اتر جاتا ہے

بعض اوقات پتہ بھی نہیں چلتا اس کا

حادثہ آتا ہے اور آ کے گذر جاتا ہے

آج اس آنکھ نے یوں دل کو کیا ہے سیراب

جیسے پھولوں سے جزیرہ کوئی بھر جاتا ہے

کیوں پریشاں ہیں نہ معلوم یہ جینے والے

جن کو جینے کی نہ توفیق ہو مر جاتا ہے

یوں تو ہلتا ہی نہیں گھر سے کسی وقت عدمؔ

شام کے وقت نہ معلوم کدھر جاتا ہے

اسقدر بھی نہ غریبوں سے خفا ہو جانا
آدمیت سے گذرنا ہے خدا ہو جانا

بھیجنا ہم کو بھی ہے گیسوئے خوباں کو پیام
اسطرف سے بھی ذرا بادِ صبا ہو جانا

میں تجھے دوسرے رستے سے ملوں گا آکر
مجھکو آتا نہیں راضی بہ رضا ہو جانا

رنگ بھی مائلِ پرواز ہے اور نکہت بھی
یاد آیا ہمیں غنچے کا صبا ہو جانا

میرے ہمراہ خرابات ہیں تو چل تو سہی
میں دکھاؤں تجھے توبہ کا گھٹا ہو جانا

زندگی کتنی دل آویز گنہ گاری ہے

ہر نئے موڑ پہ اک لغزشِ پا ہو جانا

جس جگہ میں تجھے چپکے سے اشارا کر دوں

تو وہیں قافلے والوں سے جدا ہو جانا

زندگی ساز کی آہنگ طرازی ہے عدمؔ

موت ہے ساز کا محرومِ نوا ہو جانا

تیرا ملنا تو کچھ محال نہ تھا
مجھکو اس بات کا خیال نہ تھا

میرا افسانہ ختم کیوں ہوتا
مجھکو اندیشۂ مآل نہ تھا

تیری آنکھیں بہک گئی ہونگی !
میں تو اتنا خراب حال نہ تھا

شب کہ تھا دل خرابِ خمیازہ
قائلِ ضبطِ اعتدال نہ تھا

آپ اگر بے رُخی نہ فرماتے
زندگی کو کوئی زوال نہ تھا

صُورتوں ہیں ہی عیب کچھ ہونگے
آئینے میں تو کوئی بال نہ تھا

یار تُو اور اتنی خود کامی!
یار تجھ کو مرا خیال نہ تھا

ہم عدمؔ میکدے کو لے اُڑتے
شکر ہے عہدِ برشگال نہ تھا

ایک حکایت تھرا اٹھی، ایک فسانہ جاگ اٹھا

اُس نے بجا طور کو ہنس کر دیکھا حیرت خانہ جاگ اٹھا

میرے جنوں نے چپ سادھی تھی اک نظر پہ بجنے لگی

اک دیوانہ سویا ہی تھا اک دیوانہ جاگ اٹھا

ایک گھٹا لہرا کے اٹھی، اس صبر شکن کیفیت سے

بے نیت سی نیت میں اک گرم بہانہ جاگ اٹھا

رات بہت بیوقت عدمؔ ہم جا نکلے میخانے کو

پھر بھی ہماری دستک سنکر اک پیمانہ جاگ اٹھا

کرامت کوئی حسبِ حالات ہو گی
کسی دن تو اُن سے ملاقات ہو گی

جسے صبحِ محشر کا رُتبہ ملا ہے
خوشی کی کوئی بے وفا رات ہو گی

ارے محتسب جام اگر کوئی ٹوٹا
نہ بادل گھریں گے نہ برسات ہو گی

یہاں جو بھی تازہ مسرت ملے گی
کوئی دل نشیں شکلِ آفات ہو گی

مرے دوستوں کی دل آزاریوں میں
مری بہتری کی کوئی بات ہو گی

عدمؔ اور خمیازۂ دردِ ہستی
کوئی بد دعائے خرابات ہو گی

غمِ فراواں دکھائی دیتا ہے
دل بیاباں دکھائی دیتا ہے

صرف اک آپکے نہ ہونے سے
شہر ویراں دکھائی دیتا ہے

آپکی کاکلِ پریشاں ہیں
سُنبلستاں دکھائی دیتا ہے

تیری موجودگی میں ہر غنچہ
خنداں خنداں دکھائی دیتا ہے

سانس لینے لگی ہیں اُمیدیں
ساز لرزاں دکھائی دیتا ہے

حشر بھی اک خمار آلودہ
تیرا پیماں دکھائی دیتا ہے

غنچہ پژمردگی کے عالم میں
میرا ارماں دکھائی دیتا ہے

شہرِ خوباں کو چھو نہیں سکتے
شہرِ خوباں دکھائی دیتا ہے

تیری رفتار کے تلاطم میں
محشرستاں دکھائی دیتا ہے

رات جتنی سیاہ ہوتی ہے
دل فروزاں دکھائی دیتا ہے

کیا بھروسہ عدم کنارے کا
یہ بھی طوفاں دکھائی دیتا ہے

عطا ہم کو بھی اک حسیں جام ہو
ترا بخت چمکے ترا نام ہو

تمہاری پریشان زلفوں کی خیر
ہمارا بھی سیدھا کوئی کام ہو

تمہارا ستم ہی تو ہے زندگی
تمہیں تو طبیعت کا آرام ہو

کسی کے خیالات کی صبح ہو
کسی کے خرابات کی شام ہو

عدمؔ سے بھی تھوڑا سا حسن سلوک
ستارہ جبیں ہو، گُل اندام ہو

نہیں لطف ساقی کسی بات میں
مجھے غرق کر دے خرابات میں

ہر اک بات کا فیصلہ ہو گیا
محبت کی پہلی ملاقات میں

ابھی تک خرابات گردش میں ہے
وہ دھومیں مچائیں ہیں برسات میں

بڑی تلخیاں مول لینی پڑیں
بڑے میکدے تھے خیالات میں

عدم اتفاق اور اتنا حسیں
ملاقات اور چاندنی رات میں

ساقی غمِ زمانہ کو دُشنام چاہیئے
اور میں، مجھے تو صرف ترا نام چاہیئے

اِک عُمر ہے پرستشِ یزداں کے واسطے
دو چار دن پرستشِ اصنام چاہیئے

یہ مانتا ہوں میں کہ شبِ نو بہار ہیں
زُلفِ دراز و عارضِ گلفام چاہیئے

لیکن کسی کو گھر میں بلانے کے واسطے
رطلِ شراب و شکلِ در و بام چاہیئے

ساقی مجھے شراب کی تہمت نہیں پسند
مجھ کو تری نگاہ کا الزام چاہیئے

کرتا ہے عذرِ توبہ خرابات میں عدمؔ
اے بے ادب اطاعتِ احکام چاہیئے

ہر رنج کو خفیف تبسم سے ٹال دے

نازل ہو کوئی برق تو ساغر اچھال دے

اس کی جفا کو جورِ ازل تک تو کر طویل

میری وفا کی کوئی مکمل مثال دے

صہبا کو آج جام میں مت ڈال ہمنشیں

اس کو براہِ راست میرے دل میں ڈھال دے

کتنی گریز پا ہیں مسرت کی ساعتیں

اے دوست انکے پاؤں میں زنجیر ڈال دے

ساقی تجھے سعادتِ دارین ہو نصیب !

روحِ عدم سے عقل کا کانٹا نکال دے

بادل گھرے ہیں، گیسوئے پیچاں بکھیر دو
نیندیں برس رہی ہیں، شبستاں بکھیر دو

تاخیر کیا ہے آمدِ فصلِ بہار میں
سرکار مسکرا کے گلستاں بکھیر دو

افسانہ بن گئی ہے حدیثِ کلیم و طور
اب سوئے طور مجمعِ رنداں بکھیر دو

اے میکشو بہار کی تعظیم چاہیئے
کچھ بھی نہ ہو تو جیب و گریباں بکھیر دو

حالت عدمؔ کی آج نہایت خراب ہے
اک لمحہ اپنی زُلفِ پریشاں بکھیر دو

نین جن سے ملے نہیں ہوتے
ان سے شکوے گلے نہیں ہوتے

آہ جنبش لبِ نگاراں کی!
جیسے غنچے کھلے نہیں ہوتے

خلد کی رات اور ترے گیسو
واں تو یہ سلسلے نہیں ہوتے

آج سن لو ہماری باتوں کو
روز شکوے گلے نہیں ہوتے

دیکھتے ہیں وہ یوں عدم ہم کو
جیسے پہلے ملے نہیں ہوتے

جہاں بھی نکہتِ و ام آگئی ہے

تمنّا لے کے آرام آگئی ہے

ٹھہر جا اے سحر سے چلنے والے

کہ اب تو منزلِ شام آگئی ہے

غمِ دوراں کے جلتے راستے میں

اچانک گردشِ جام آگئی ہے

بزرگوں نے دُعا بھی خوب دی تھی!

بزرگوں کی دُعا کام آگئی ہے

سحر گھبرا کے جب رُخصت ہوئی ہے

پلٹ کر ساعتِ شام آگئی ہے

خطا تو چشمِ ساقی سے ہوئی تھی!

عدمؔ تہمت مرے نام آگئی ہے!

شامِ فراق کم نہیں روزِ شمار سے
کرتے ہیں ذکرِ حشر کا کس اعتبار سے

بادہ کشی حرام ہے یا زندگی حرام
تصدیق کر رہا ہوں غمِ روزگار سے

ساقی شراب حسبِ ضرورت منگا کے رکھ
عمرِ خزاں طویل ہے عمرِ بہار سے

اِک جامِ زہر ہی کوئی دیتا خلوص سے
اتنا بھی ہو سکا نہ کسی غم گسار سے

مفہوم گفتگو کا ملے بھی تو کیا عدمؔ
کرتے ہیں گفتگو وہ بڑے اختصار سے

ہرچند بدظنی سی ہے کچھ تیرے نام سے
لیتا ہوں تیرا نام بڑے احترام سے

ساقی ترے خلوص نے گرویدہ کرلیا
آیا تھا ورنہ میں بھی اِدھر ایک کام سے

گذرے گی زندگی کی سیہ رات کس طرح
دل کا چراغ گُل ہوا جاتا ہے شام سے

فرصت نہ مِل سکی ہمیں آلامِ زیست سے
ورنہ بُلا رہا تھا کوئی ہر مقام سے

جو لمحہ میکدے کی ہوا میں کٹے عدمؔ
وہ لمحہ قیمتی ہے حیاتِ دوام سے

کیوں رنگ اُڑ رہا ہے دلِ بیقرار کا
شاید یہ رہنے والا نہیں اس دیار کا

کھِلنے لگا تھا پھول کہ مُرجھا کے گر گیا
کیا تنگ حوصلہ تھا ہوائے بہار کا

لو، جا رہا ہوں قیدِ عناصر کو توڑ کر
پہلا ثبوت ہے یہ مرے اختیار کا

پیتا ہوں حادثات کے عرفاں کیلئے
مَے ایک تجزیہ ہے غمِ روزگار کا

ساقی حدیثِ کوثر و تسنیم سب غلط!
ساغر چھلک گیا تھا کسی مَے گسار کا

دھوکا دیا ہے تم نے عدمؔ کے خلوص کو
یہ راستہ نہیں تھا تمہارے دیار کا

گھر تے ہیں لوگ گرمیٔ بازار دیکھ کر
سرکار دیکھ کر، مری سرکار دیکھ کر

یہ بھی ہے رہبروں کے کرم سے جلی ہوئی
ڈرتی ہے عقل راہ کو ہموار دیکھ کر

آوارگی کا شوق بھڑکتا ہے اور بھی
تیری گلی کا سایۂ دیوار دیکھ کر

تسکینِ دل کی ایک ہی تدبیر ہے فقط
سر پھوڑ لیجیے کوئی دیوار دیکھ کر

ہم بھی گئے ہیں ہوش سے ساقی کبھی کبھی
لیکن تری نگاہ کے اطوار دیکھ کر

کیا مستقل علاج کیا دل کے درد کا
وہ مسکرا دیئے مجھے بیمار دیکھ کر

وہ کون تھا جہاں میں جو ہم کو خریدتا
ہم بک گئے خلوصِ خریدار دیکھ کر

لے آئی زلیست کون و مکاں کی اذیتیں
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

دیکھا کسی کی سمت تو کیا ہو گیا عدمؔ
چلتے ہیں راہ رو سرِ بازار دیکھ کر

وہی ابتلا ہے وہی بے کلی ہے
مگر خیر اک آرزو تو جلی ہے

بڑی دیر کے بعد مانا ہے دل نے
زمانے سے نا آشنائی بھلی ہے

صراحی سے ابھرے ہیں ڈوبے ستارے
پیالوں میں عمرِ گذشتہ ڈھلی ہے

ہوا کے تھپیڑوں کو نیند آ رہی ہے
نہ جانے کدھر آج کشتی چلی ہے

مجھے اے عدم کیا اندھیروں کا کھٹکا
مرے جام میں چاندنی کی ڈلی ہے

جس کام کی ہے توفیق تجھے اس کام میں کچھ تاخیر نہ کر
کچھ کر تو سہی گر کرنا ہے تخریب ہی کر، تعمیر نہ کر

ہر سعیٔ ہزیمت خوردہ ہیں اک قدر ہے اونچے رتبے کی
ہر سعیٔ ہزیمت خوردہ کو ناکامی سے تعبیر نہ کر

کچھ اور ہی عالم ہے ساقی اس وقت شعورِ مستی کا
آنکھوں سے تکلم کر بے شک، ہونٹوں سے کوئی تقریر نہ کر

کافر کی تواضع کر لینا، اسلام نے جائز رکھا ہے
پر ہیز کر منافق کی عزت! مومن ہے تو یہ تکفیر نہ کر

تدبیر تو، تو نے کافی کی اصلاحِ عدمؔ کی اے ناصح
اب اُس کو تھپیڑے کھانے دے اب تو بھی کوئی تدبیر نہ کر

دل نے کھینچی ہے تری زلف کے سر ہونے تک

وہ جو قطرے پہ گذرتی ہے گہر ہونے تک

ہے نکھرنے کے لئے شرط اگر خونِ جگر

جل نہ جائے گا چمن خونِ جگر ہونے تک

پہلا احساسِ طرب ہی اَلَم افزا نکلا!

دیکھیں کیا حال ہو احساس دگر ہونے تک

لا مئے ناب کہ شادابیٔ گلہائے خیال!

روٹھ جائے نہ بہارِ دل کا گذر ہونے تک

اب ہمارے لئے اتنی کبھی نہ زحمت فرما

ہم کہاں ہوں گے ترا لطفِ نظر ہونے تک

شمع ہی پر نہیں موقوف، مئے و نغمہ و گُل
سرد ہو جاتی ہے ہر چیز سحر ہونے تک

ہم کو پہچان ہی لے گی کبھی رحمت تیری
عیب کو وقت ہے درکار ہُنر ہونے تک

بعد اس کے کوئی تقریب نہیں ہے غم کی
آج تم پاس رہو میرے سحر ہونے تک

تم کو ناحق یونہی تکلیفِ خبر کیا دینا
ہم کو رہنا ہی نہیں تم کو خبر ہونے تک

وقت سے پہلے بھی کٹ جاتی ہے مہلت غم کی
شمع ہر رات نہیں جلتی سحر ہونے تک

کتنی مستی تھی عدمؔ غنچہ و گُل پر طاری
گلستاں میں مری تردیدِ نظر ہونے تک

فضا ہنس رہی ہے ہوا گا رہی ہے
بڑی تمکنت سے بہار آ رہی ہے

ترے جسم کی چاندنی اللہ اللہ
مجھے صبحِ تخلیق یاد آ رہی ہے

نہ آواز دو میری عمرِ رواں کو
کوئی اور گھر ڈھونڈنے جا رہی ہے

نقاب اُن کے چہرے سے سرکی ہے شاید
بڑی دُور تک برق لہرا رہی ہے

غمِ زندگی کی حکایات سُن کر!
عدمؔ آج ہم کو بھی نیند آ رہی ہے

ارے میگسارو! سویرے سویرے

خرابات کے گرد پھیرے پہ پھیرے

بڑی روشنی بخشتے ہیں نظر کو

ترے گیسوؤں کے مقدس اندھیرے

کبھی دن ادھر سے گزر کر تو دیکھو

بڑی رونقیں ہیں فقیروں کے ڈیرے

یہ کیا سائے سے اٹھ رہے ہیں افق سے

گلابی گلابی، گھنیرے گھنیرے

غم زندگی کو عدم ساتھ لے کر!

کہاں جا رہے ہو سویرے سویرے

امیروں میں اخلاص کم دیکھتے ہیں
تنگ ظرفیٔ جامِ جم دیکھتے ہیں

ابھی دیکھنے کا یہ عالم ہے جیسے
نہ وہ دیکھتے ہیں نہ ہم دیکھتے ہیں

کہاں جا کے روپوش ہو گی محبّت
خدا دیکھنا ہے صنم دیکھتے ہیں

وہیں بیٹھ جاتے ہیں رندانِ تشنہ
جہاں شب کے ہنگامِ نم دیکھتے ہیں

کتابوں سے یہ شے نہیں ہاتھ لگتی
پیالوں میں احوالِ جم دیکھتے ہیں

جب آغاز کر دیں کسی کام کا ہم
تو پھر سوئے انجام کم دیکھتے ہیں

دُہائی ہے اے مفلسی کے تبسم
مری سمت اہلِ کرم دیکھتے ہیں

زمانے کی کیا تاب پہنچے وہاں تک
ترے حُسنِ نیت کو ہم دیکھتے ہیں

ترے انکھڑیوں میں بھی کچھ لوگ ساقی
مدام کی محبت رقم دیکھتے ہیں

چلے ہو غریبوں سے رنجور ہو کر

ابھی لوٹ آؤ گے مجبور ہو کر

سُنا ہے غرور اک حسیں خستگی ہے

پشیماں نہ ہوں آپ مغرور ہو کر

مجھے آزمائش میں مت ڈالئے گا

میں مر جاؤں گا آپ سے دُور ہو کر

اُن آنکھوں کی حالت کچھ ایسی ہے جیسے

اُٹھے میکدے سے کوئی چور ہو کر!

ابھی تو کھلا تھا عدمؔ غنچۂ دل

کہاں اڑ گیا رنگ کافور ہو کر

وہ دل میں آبلے ہیں رونقِ تعمیرِ جاں ہو کر
ہمیں رہنا پڑے گا مدتوں اب لامکاں ہو کر

ہمارے گلشنِ حرماں کی جانب کون آتا ہے
نکل جاتے ہیں کچھ جھونکے اِدھر نوحہ خواں ہو کر

خدا غارت کرے گلشن کے بد اندیش تنکوں کو
یہ ظالم جل ہی جاتے ہیں کسی کا آشیاں ہو کر

رواں ہے قافلہ اس ہجوم گر مجھ شی سے
اڑے جاتے ہیں ہم بھی ساتھ گردِ کارواں ہو کر

اگرچہ آپ کی اس میں نہیں کچھ بھی خطا تاہم
بڑی تکلیف دی ہے آپ نے آرامِ جاں ہو کر

باتِ عارضی کیوں قید ہے دامِ عناصر میں
نو ذ ب عدم کے پیرہن کی دھجیاں ہو کر

چشمے بہت ہیں ساز بہت گلستاں بہت

تفریح و سیر کیلئے کون و مکاں بہت

اک حسنِ سرمدی نظر آتا ہے چار سُو

ہوتا ہے ہم پہ جب وہ حسیں مہرباں بہت

گلشن میں حفظِ توبہ کی تلقیں نہ کیجئے

صبر آزما ہے خندۂ گل کا سماں بہت

طرزِ نظر سے ملتی ہے کچھ مختلف خبر

یوں تو دکھائی دیتے ہیں وہ بدگماں بہت

اب موسمِ بہار کو آواز دیجئے

ناراج کر چکی ہے چمن کو خزاں بہت

محتاط ہو کے کیوں نہیں چلتے ستم ظریف
لٹتے ہیں رہ گذار میں جب کارواں بہت

جس شاخ پر ہمارے نشیمن کی دھوم تھی
اب اُس پہ بن چکے ہیں عدم آشیاں بہت

خرابات میں ہم کو لے جا رہے ہو
یہ کیا قیمتی ظلم فرما رہے ہو

قیامت کا بازار کیا گرم ہو گا
نہ ہم جا رہے ہیں نہ تم آ رہے ہو

بڑے نکتہ رس ہو مرے خیر خواہ ہو
مجھے اُن کے بارے میں سمجھا رہے ہو

کسی ضابطے میں تو زلفوں کو لاؤ
نہ اُلجھا رہے ہو نہ سُلجھا رہے ہو

کوئی اور تہمت تو باقی نہیں ہے
بڑی دلنوازی سے پیش آ رہے ہو

عدمؔ کس متانت سے بیمار ہو کر
جواں گیسوؤں کی ہوا کھا رہے ہو

غمِ زندگی مسکراتا رہے گا
حسینوں سے ملتا ملاتا رہے گا

اُٹھا ساغرِ مے نہ کر فکرِ دوراں
زمانہ ہے چلنا چلاتا رہے گا

ابھی انعقادِ قیامت نہ کیجیے
یہ جھوٹا سہارا ابھی جاتا رہے گا

ہماری نہ تشویش کر کوئی ساقی
ہمیں خود بخود ہوش آتا رہے گا

عدمؔ دل کو چسکا ہے آوارگی کا
اسے جتنا روکو گے جاتا رہے گا

کہاں تک جا رہی ہے بد گمانی دیکھتے جاؤ
گلوں کا رنگ بھی ہے پانی پانی دیکھتے جاؤ

تغیر اک طبعی خاصیت ہے بزمِ ہستی کی
مسلسل انقلابِ آسمانی دیکھتے جاؤ

نگاہِ حسن میں ہے وقت کی رفتار گردش میں
جوانی پھونکتے جاؤ، جوانی دیکھتے جاؤ

مبادا خود ہی ساحل کی طرف لیجائے کشتی کو
تماشا کیا دکھاتی ہے روانی دیکھتے جاؤ

جوانی کو دلیلِ معصیت گردانتے والو
مرا معیارِ تقدیسِ جوانی دیکھتے جاؤ

شکستِ ساز کے ہمراہ رخصت ہیں بہاریں بھی
ادھر آؤ مآلِ شادمانی دیکھتے جاؤ

عدمؔ میں پیتا ہوں اس ڈر سے کہیں حیواں نہ بن جاؤں
شبابِ آدمیت کی جوانی دیکھتے جاؤ

سننے والا حالِ دل احساس سے بیگانہ تھا
اُس نے یہ سمجھا کہ میں نے جو کہا افسانہ تھا

آہ وہ عہدِ جوانی کے مقدس مشغلے!
میکدہ تھا یا طوافِ کوچۂ جانانہ تھا

عارضوں میں بُتکدہ تھا گیسوؤں میں کہکشاں
انکھڑیوں میں چاندنی تھی ہاتھ میں پیمانہ تھا

شمع کے نزدیک کوئی تنتے تو تھی کل رات کو
یا کوئی بجلی تھی رقصاں یا کوئی پروانہ تھا!

اللہ اللہ صورتوں کی بدگمانی کا شباب
آئنے کو غور سے دیکھا تو حیرت خانہ تھا

عقل کے بارے میں اتنا جانتے ہیں ہم عدمؔ
جس میں تھوڑی سی فراست تھی وہی دیوانہ تھا

کاش اتفاق سے کبھی آپ تو بلائے دوست
دل بھی برائے دوست ہے جاں بھی برائے دوست

دل میں عجب سکون سا ہوتا ہے موجزن
آتی ہے گاہ گاہ جو کہیں سے صدائے دوست

اب انتخاب ہو بھی تو کیا انتخاب ہو..!
دوزخ ادائے دوست ہے جنت رضائے دوست

یارو شبابِ موسمِ گُل اور یہ بے حسی!
لاؤ ذرا سی گرمیٔ رنگِ قبائے دوست

ہم کہہ رہے ہیں روٹھا ہوا یار ہی ملے
ہم بے ادب نہیں کہ کہیں مسکرائے دوست

ساغر عدم اٹھاؤں کہ پہلے وضو کریں
یہ بھی رضائے دوست ہے وہ بھی رضائے دوست

بتوں سے آشنائی کر رہے ہیں
خدا والے خدائی کر رہے ہیں

نہ جانے آج وہ کس مصلحت سے
ہماری ہمنوائی کر رہے ہیں!

جوانی کی گھنیری ظلمتوں میں
ستارے رہنمائی کر رہے ہیں

کچھ اس اخلاص سے پیتے ہیں مئے ہم
کہ جیسے پارسائی کر رہے ہیں

محبت کیا، محبت کا جنوں کیا
یونہی کچھ جگ ہنسائی کر رہے ہیں

معاذ اللہ کیا حسنِ وفا ہے
وہ ہم سے بے وفائی کر رہے ہیں

بڑا اخلاص ہے اُن کی جفا میں
بڑی بے اعتنائی کر رہے ہیں

عدمؔ موسیٰ سے کہہ دو وہ مکرر
خطائے رونمائی کر رہے ہیں

محبت رنگ ہوتی ہے محبت نور ہوتی ہے
طبیعت دیکھ کر تم کو بہت مسرور ہوتی ہے

بالآخر شیشۂ دل کا یہی انجام ہونا تھا
معاذ اللہ! ایسی چیز بھی کیا چور چور ہوتی ہے

یہاں ہر مہ جبیں کی آنکھ برقِ طور ہے ساقی
مگر رندوں کی بینائی کہاں معذور ہوتی ہے

ہمارے ساتھ چلکر آپ کیوں نقصان اٹھاتے ہیں
جہاں ہم کو پہنچنا ہے وہ منزل دور ہوتی ہے

دیا ہے درس اسکندر کو یہ خضرِ طریقت نے
بسا اوقات ظلمت نور سے معمور ہوتی ہے

محبت کا تعلق کیا امیر دل سے وزیر دل سے
محبت تو بچاری قسمتِ مزدور ہوتی ہے

مجھے طوفان سے کچھ ایسی بے پایاں محبت ہے
کنارے سے مری کشتی ہمیشہ دور ہوتی ہے

مرا دل ہے جو باوصفِ ضرورت تشنہ رہتا ہے
تمہاری آنکھ ہے جو بے سبب مخمور ہوتی ہے

پتنگے جل ہی جاتے ہیں نقابِ شمع کو چھو کر
عدمؔ دیوانگی اخلاص کا دستور ہوتی ہے

سر رہ گیا ہے دوش پہ اور دل نہیں رہا

کیا اس جہان میں کوئی قاتل نہیں رہا

کُنجِ قفس میں ہو تو قرینِ قیاس ہے

صحنِ چمن میں شورِ عنادل نہیں رہا

جب بھی نظر ملائی ہے اس نے خلوص سے

میں خود کبھی درمیان میں حائل نہیں رہا

آخر یہ کس لئے مجھے سمجھا رہے ہیں لوگ

میرا خیال ہے کہ میں جاہل نہیں رہا

یوں ہنس رہا ہوں دل کی خرابی پہ جسطرح

میں دل کے کاروبار میں شامل نہیں رہا

اے چشمِ یار اب نہ تغافل نہ التفات

کیا میں کسی سلوک کے قابل نہیں رہا

اے ناخدا سفینے کا اب کوئی غم نہ کر

ہم فرض کر چکے ہیں کہ ساحل نہیں رہا

کچھ تو ترے خلوص کی تعظیم تھی عدمؔ

ورنہ وہ جان بوجھ کے غافل نہیں رہا

نادم ہیں ہم حضور کو تکلیف دی گئی
ظلمت بہت تھی نور کو تکلیف دی گئی

جب تابِ دید سے بھی تو عاری تھا اے کلیم
پھر کیوں نگارِ طور کو تکلیف دی گئی

کہتے تھے لوگ آپ نہ آئیں گے میرے پاس
اس واسطے حضور کو تکلیف دی گئی

اس گیسوئے سیاہ کی تدوین کے لئے
مہتاب کے شعور کو تکلیف دی گئی

تشکیلِ برگ و سازِ ہوس کے لئے عدم
کن خوشنما امور کو تکلیف دی گئی

مے میں ملا کے تھوڑی سی شبنم گلاب کی
تخلیق کر رہا ہوں نئے آفتاب کی

بس اتنا واسطہ ہے مرا اُن سے جسطرح
کانٹے کی عرض اور سماعت گلاب کی

جنت کے فلسفے کو ملی جس سے روشنی
چھوٹی سی بھول تھی مرے عہدِ شباب کی

اے عقل بے ادب مری وحشت پہ ناز کر
اصلاح کر رہا ہوں جہانِ خراب کی

باتیں وہ ایسی کرتے ہیں رنگین اے عدمؔ!
جیسے کوئی حسین کہانی کتاب کی!

شادابیٔ مزاجِ بہاراں کا وقت ہے

گُل ریزیٔ خرامِ غزالاں کا وقت ہے

ایسا خدا کسی پہ نہ لائے شدید وقت

اے دوستو جدائیٔ یاراں کا وقت ہے

زلفیں بکھیر، جام اٹھا، ہنس کے بات کر

ساقی نزولِ رحمتِ یزداں کا وقت ہے

یادِ خدا میں کون جوانی کا خوں کرے

یہ وقت تو پرستشِ خوباں کا وقت ہے

اے شیخ میکدے سے تو رخصت بھی ہو گئیں

اے بے ادب عبادتِ یزداں کا وقت ہے

میں دل ہوں، آپ جان ہیں اور اتفاق سے
یہ وقت اتصالِ دل و جاں کا وقت ہے

اے غیرتِ مسیح تری آنکھ کے نثار
غم ہائے لا علاج کے درماں کا وقت ہے

ساحل عزیز کس کو نہیں اے عزیزِ من
لیکن یہ وقت شورشِ طوفاں کا وقت ہے

اے عقل فصلِ گُل میں نہ کر اذنِ احتیاط
اے نامراد چاکِ گریباں کا وقت ہے

خلوت میں بھی حضور اٹھاتے نہیں نظر
کیا یہ بھی التفاتِ گریزاں کا وقت ہے

یزداں و اہرمن کے زمانے گزر گئے
اب وقت ہر لحاظ سے انساں کا وقت ہے

کیا کر رہا ہے بیٹھ کے حجرے میں اے عدمؔ
ظالم طوافِ کوچۂ جاناں کا وقت ہے

ہر گام پر خلوص کی شمعیں جلاؤں گا!
زندہ ہوں اس لئے کہ ترے کام آؤں گا

آئی ہے مجھکو اس لئے بے ساختہ ہنسی
مجھکو یقیں نہ تھا میں کبھی مسکراؤں گا

میں نے کبھی تجھکو پیار کیا ہے خلوص سے
اے دوست میں بھی تجھکو کبھی یاد آؤں گا

پہچانتے نہ ہو تو ابھی تک سے چلے چلو
کھٹکا کبھی ہے میں تمہیں پہچان جاؤں گا

بیٹھو مجھے تعاقب ماضی میں دوستو
میں اس گریزپا کو ابھی ڈھونڈ لاؤں گا

جب تک جگر میں خوں ہے علاج موت دہم ہے
جب تک نظر جواں ہے مرادیں مناؤں گا!

وہ بات کی خوشی وہ ملاقات کی خوشی
شاداب جھومتے ہوئے حالات کی خوشی

اے قلبِ نامراد یہ دنیائے عقل ہے
جائز نہیں یہاں کوئی جذبات کی خوشی

ملتے تو آپ اب بھی محبت سے ہیں مگر
دل ڈھونڈتا ہے پہلی ملاقات کی خوشی

خونِ ہزار خمکدہ موجود چاہیئے
پیشِ نظر ہے تھوڑی سی برسات کی خوشی

ہم سے خراب حالوں سے پوچھے کوئی عدم
کیا چیز ہے خرابیٔ حالات کی خوشی

شہرت پکڑ رہا ہے مرے غم کا راز بھی

دُنیا ہے بے شعور کبھی افسانہ ساز بھی

اک رات سے زیادہ نہ مجھ پر بکھر سکی

حد درجہ مختصر تھی وہ زلفِ دراز بھی

ہے میرا کفر تمکنتِ بندگی کی آگ!

میرے ہی گھر کی راکھ ہے تیری نماز بھی

جو کم ہے کم تجلّیٔ برقِ فنا نہ ہو!

کیا اس قدر بھی ہوئی آہنگ ساز بھی

خونِ جگر ہے محنتِ فرہاد کا صلا

بیکار دو سوسے ہیں خلوص و نیاز بھی

اُٹھی شراب ڈس بھی گئی تلخیٔ ہوس
اس زندگی کا اصل بھی دھوکا مجاز بھی

دیکھیں جنونِ شوق کا کیا حشر ہو عدمؔ
دل غم پرست بھی ہے حوادث نواز بھی

یُوں سازِ نو بہار کی آواز آ گئی!
ٹوٹے ہوئے پروں کو بھی پرواز آ گئی

کھولی تھی ہم نے آنکھ کہ عیّارِ زندگی
لے کر بہار و میکدہ و ساز آ گئی

اک سمت میں تھا، ایک طرف دو جہاں کے غم
پرور میاں میں وہ نگہِ ناز آ گئی

بیٹھے تھے ساکنانِ قفس یونہی نا امید
اڑنے لگے تو طاقتِ پرواز آ گئی!

میں کھو چلا تھا دشتِ تجسس میں اے عدمؔ
لیکن کوئی سُنی ہوئی آواز آ گئی

وہ زلف یوں بکھر کے دل آرام ہو گئی
دن گرمیوں کا ڈھل گیا اور شام ہو گئی

تھی گردشِ زمانہ گراں حال کس قدر
تھوڑی سی پی کے کیا سبک اندام ہو گئی

وہ جنبشیں تھیں ایک فسوں ساز آنکھ کی
اک کائنات بن گئی اک جام ہو گئی

اے قلبِ نامراد توقف بھی کر کہیں
ہر قافلہ ٹھہرنے لگا شام ہو گئی

بے احتیاطیوں کے تدبر سے اے علامؔ
ہر تلخئ حیات دل آرام ہو گئی

جام بر دست و نیستاں بہ کنار آئی ہے
جھوم کر میکدہ بردوش بہار آئی ہے

زندگی میری نہ معلوم خوشی کے لمحے
کس سمن پوش کے کوچے میں گزار آئی ہے

یوں ڈبو کر ہمیں لوٹی ہے مسرت سے حیات
کوئی سمجھے کہ کنارے پہ اتار آئی ہے

عقل جو ایک خرابی کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی دانست میں دنیا کو سنوار آئی ہے

پھول سے لے کے کلی تک ہے قلق کا عالم
اب کے کچھ ایسی قیامت کی بہار آئی ہے

کل بھی میخانے سے کچھ قرض لیا تھا ہم نے
آج بھی زندگی کمبخت ادھار آئی ہے

لوٹ آئی ہے نظر گرچہ پشیماں ہو کر
نخوتِ سنگ کو اک تیر تو مار آئی ہے

غم کی افکار میں ڈوبی ہوئی راتوں میں عدمؔ
نیند بھی صورتِ الزام قرار آئی ہے

ک جامِ زیست بخش کا حقدار ہوگیا
لینے میں توبہ کرتے ہی ہمیار ہوگیا

جھٹکے جو اُس نے بال نہا کر ہواؤں میں
عالم تمام مسلکِ گہر بار ہوگیا

اب کس لئے نگاہِ تکبر رہے بے حجاب
جس کا تمہیں خیال ہے وہ وار ہوگیا

اب طُور پر کبھی وہ تماشا نہیں ہوا
موسیٰ فریب کھا کے خبردار ہوگیا

اب وقت ہے کہ آپ کے قدموں کو چوم لوں
دنیا سمجھ رہی ہے میں خوددار ہوگیا

ہر لغزشِ شدید نے بخشی عدمؔ خرد
ہر حادثہ شعور کا معمار ہوگیا

ہنس ہنس کے جھوم جھوم کے مسکرا کے لا
پھولوں کے رس میں چاند کی کرنیں ملا کے لا

محسوس ہو رہا ہے ستارے علیل ہیں
ان کو بھی چند گھونٹ کہیں سے پلا کے لا

کہتے ہیں عمرِ رفتہ کبھی لوٹتی نہیں!
جا میکدے سے میری جوانی اٹھا کے لا!

میں اپنی لغزشوں کو دکھاتا ہوں آئینہ
تو اپنے گیسوؤں کو مقابل گھٹا کے لا!

دیکھی نہیں ہے تو نے کبھی زندگی کی لہر
اچھا تو جا عدمؔ کی صراحی اٹھا کے لا

اُس جشن کی کیا تو صبح ہوئی اُس دام کا کیا انجام ہوا

اُس صبح کا کیا ماحول رہا اُس شام کا کیا انجام ہوا

رستے میں مسافر دو لمحے گلزار کے ٹھنڈے سایوں میں

آرام کی دھن میں بیٹھے تھے آرام کا کیا انجام ہوا

اب کیوں وہ تلاطم ساکت ہے اب کیوں وہ امنگیں ٹھنڈی ہیں

جس کام کا سودا تھا تم کو اُس کام کا کیا انجام ہوا

جو ساز اٹھایا تھا تم نے اس ساز سے کیسی جوت بہی

جو جام اُچھالا تھا تم نے اُس جام کا کیا انجام ہوا

کہتے تھے عقیدت مندوں کو احکام نہ اتنے فرماؤ

دیکھا ہے نہ اب سرکار مری، احکام کا کیا انجام ہوا

الزام تو آیا تھا ہم پر لیکن یہ عدم معلوم نہیں

الزام لگانے والوں کے اکرام کا کیا انجام ہوا

ان زہرہ جمالوں سے ساقی میلانِ طبیعت ٹھیک نہیں

اظہارِ عقیدت بہتر ہے، اظہارِ محبت ٹھیک نہیں

اے پیرِ مغاں دے اذن کہ میں حالات میں کچھ ترمیم کروں

محسوس یہ ہوتا ہے مجھ کو اطوارِ مشیت ٹھیک نہیں!

ہر چند محبت ہے اس سے اور اندھی محبت ہے اس سے

تاہم ہے اصولِ عشق یہی اظہارِ محبت ٹھیک نہیں

اے داورِ محشر کیا جب تک نہ غزالاں رقص کریں

ہے تو رقیامت تو برپا، رفتارِ قیامت ٹھیک نہیں

تالیفِ طبیعت کی خاطر ہے شرط مزاج آگاہی کی،

تالیفِ طبیعت کی خاطر اے دوست نصیحت ٹھیک نہیں

جب تک تری چشمِ مئے آگیں سے کوئی حسیں عنواں نہ ملے
تب تک یہ عقیدہ ہے میرا، آغازِ حکایت ٹھیک نہیں

یہ بات سبے کیا یہ قہر ہے کیا، بلکہ بھی وہی محرومی سی
یا تیری طبیعت برہم ہے یا میری طبیعت ٹھیک نہیں

اے کاش عدمؔ اس رات کوئی احوال کا محرم آجائے
خلوت کا کلیجہ زخمی ہے گھر بار کی حالت ٹھیک نہیں

نیّت درست کرکے یقین لا کے پی گیا
اُن انکھڑیوں سے مشورہ فرما کے پی گیا

میرے لئے حرام تھی اُس کے لئے حلال
کم بخت کس طرح مجھے بہکا کے پی گیا

پینے کا واقعہ کوئی ایسا اہم نہیں
پینے کا اشتیاق تھا لہرا کے پی گیا

توبہ کے ٹوٹنے کا بھی کچھ کچھ ملال تھا
تھم تھم کے سوچ سوچ کے شرما کے پی گیا

ساغر بدست بیٹھی رہی میری آرزو
ساقی شفق سے جام کو ٹکرا کے پی گیا

مے ہی حسین چیز ہو اور واقعی حرام

میں کثرتِ شکوک سے گھبرا کے پی گیا

سو بار لغزشوں کی قسم کھا کے چھوڑ دی!

سو بار چھوڑنے کی قسم کھا کے پی گیا

وہ دشمنوں کی طنز کو ٹھکرا کے پی گئے

میں دوستوں کے غیض کو بھڑکا کے پی گیا

صد ہا مطالبات کے بعد ایک جامِ تلخ

دنیائے جبر و صبر کو دھڑکا کے پی گیا

پیتا کہاں تھا صبحِ ازل میں بھلا عدمؔ

ساقی کے اعتبار پہ لہرا کے پی گیا

بزمِ طرب میں سایۂ غم کو بھی لے چلو

جاتے ہو میکدے کو تو ہم کو بھی لے چلو

جاتے ہو میکدے کو تو ایمان و کفر کیا

ڈر ہے تو ساتھ دیر و حرم کو بھی لے چلو

محشر کی دھوپ ہے کوئی چھوٹی سی شے نہیں

آتشکدے میں زُلفِ صنم کو بھی لے چلو

جس میکدے سے ملتی ہے مے ہر فقیر کو

اک دن وہاں پیالۂ جم کو بھی لے چلو

کہتے ہیں اُس گلی کی ہوا میں ہے زندگی

یوں ہو تو ساتھ اپنے عدمؔ کو بھی لے چلو

بگڑے وہ یوں کہ جیسے محبّت گناہ تھی
جھولی فقیر کی تھی کہ میری نگاہ تھی

محشر کے تذکرے تو بہت سنتے آئے تھے
دیکھا تو اک حسین کی ترچھی نگاہ تھی

تیری نظر نے اس میں ذرا جان ڈال دی
ویسے تو زیست ایک سسکتی سی آہ تھی

اُس شئے کو کہہ رہے ہیں حرام اہلِ آگہی
جس کے بغیر جنّتِ آدم تباہ تھی

جس شئے میں خامیاں تھیں جمکدار تھی عدم
جس شئے میں کوئی عیب نہیں تھا سیاہ تھی

میں حادثوں سے جام لڑاتا چلا گیا

ہنستا ہنساتا، پیتا پلاتا چلا گیا

نقش و نگارِ زیست بنانے کا شوق تھا

نقش و نگارِ زیست بناتا چلا گیا

اُتنے ہی اختلاف اُبھرتے چلے گئے

جتنے تعلقات بڑھاتا چلا گیا

طوفاں کے رحم پر تھیں فقیروں کی کشتیاں

طوفاں ہی کشتیوں کو چلاتا چلا گیا

دنیا مری خوشی کو بہت گھورتی رہی

میں زندگی کا ساز بجاتا چلا گیا

آتی رہی جواب میں آوازِ بازگشت
جب تک میں اُس حسیں کو بلاتا چلا گیا

وہ رفتہ رفتہ جام پلاتے چلے گئے
میں رفتہ رفتہ ہوش میں آتا چلا گیا

ہر میکدے سے ایک عقیدت تھی اے عدمؔ
ہر مہ جبیں سے آنکھ ملاتا چلا گیا

صدہا تکلفات کے بعد اک نظر اٹھی
بھرپور اٹھی اگرچہ بہت مختصر اٹھی

اٹھی وہ چشم مست کچھ اس احتیاط سے
کوئی نہ کر سکا یہ تعین کدھر اٹھی

ساغر اٹھا ہی تھا کہ بہاریں مچل پڑیں
گیسو کھلے ہی تھے کہ گھٹا جھوم کر اٹھی

کھلتا نہ تھا نگاہ کا مطلب مگر کھلا
اٹھتی نہ تھی شراب کی تہمت مگر اٹھی

اٹھی ہماری سمت بھی وہ آنکھ بارہا
لیکن ہر ایک بار برنگ دگر اٹھی

دنیائے آب و رنگ کا چہرہ اتر گیا
جب بھی مری نگاہِ حقیقت نگر اٹھی

میں اور شکستِ توبہ کا اتنا جنوں عدمؔ
وہ یہ ہوا کہ جام سے پہلے نظر اٹھی

خرد کے دام میں جو آ گئے ہیں

وہ دانشمند دھوکا کھا گئے ہیں

ابھی تو فصلِ گل کی ابتدا تھی

ابھی سے پھول کیوں مرجھا گئے ہیں

کچھ ایسے آپ نے پھیری ہیں آنکھیں

زمانے کے ستم شرما گئے ہیں

تری آنکھوں کی فرمائش پہ انساں

فریبِ زندگی بھی کھا گئے ہیں

عدمؔ سے زندگی روٹھی ہوئی تھی

خدا کا شکر ہے آپ آ گئے ہیں

یہ الگ بات ہے ساقی کہ مجھے ہوش نہیں
ورنہ میں کچھ بھی ہوں احسان فراموش نہیں
نکہتِ گل بھی ہے اک وحشتِ نازک کی مثال
بارِ ہستی سے کوئی چیز سبکدوش نہیں
ہائے اُس رند کے کمزور ارادوں کا عروج
میکدہ پی کے بھی جو غافل و مدہوش نہیں
ہم اگر حشر میں بھی ہو گئے رُسوا یارب
ہم کو یہ کہنا پڑے گا تو خطا پوش نہیں
کیوں نہ بازار کی اس وقت ذرا سیر کریں
میں بھی مدہوش نہیں آپ بھی مدہوش نہیں

مے پلائی ہے تو اب نعرۂ مستی کو نہ روک
زندگی ساقیا اک گریۂ خاموش نہیں

کس نے فرمائی تھی تلقینِ جنون صبح ازل
آج تک ہم کو گریباں کا کوئی ہوش نہیں

آہ وہ قرب کہ ہے دوریِ افزوں کی دلیل
ہائے وہ وصل کہ آغوش در آغوش نہیں

اِس مروّت سے وہ معبود ہوا ہے عُریاں
مجھ کو آدابِ عبادت کا بھی کچھ ہوش نہیں

ہوش خمیازۂ ہستی ہے تو مطلب یہ ہے
جس کو کچھ ہوش ہے اسکو بھی کوئی ہوش نہیں

بے خودی میں مرا آغوش ہے تجھ سے آگے
شرم مت کیجئے میں شاملِ آغوش نہیں

کس طرح بیٹھ گئے وہ مرے پہلو میں علامؔ
شک یہ پڑتا ہے کہ شاید مرا آغوش نہیں

پھولوں کی آرزو میں بڑے زخم کھائے ہیں
لیکن چمن کے خار بھی اب تک پرائے ہیں

اُس پر حرام ہیں غمِ دوراں کی تلخیاں
جس کے نصیب میں تری زلفوں کے سائے ہیں

روشن کئے ہیں دل میں تمناؤں کے چراغ
ویران بستیوں میں مسافر بسائے ہیں

محشر میں لے گئی تھی طبیعت کی سادگی
لیکن بڑے خلوص سے ہم لوٹ آئے ہیں

آیا ہوں یاد بعدِ فنا ان کو اے عدمؔ
کیا جلد میرے صدق پر ایمان لائے ہیں

تمنا زندگانی بن گئی ہے

کہانی اب کہانی بن گئی ہے
ترے ملنے کی مبہم سی توقع
حیاتِ جاودانی بن گئی ہے
مصیبت پر ہنسی آئی ہے اتنی
مصیبت شادمانی بن گئی ہے
ہر اک شے حدِ جائز سے گزر کر
بلائے ناگہانی بن گئی ہے

عدم اخلاص سے جب بھی ہوئی ہے
عداوت مہربانی بن گئی ہے

وجودِ حُسن احساسِ نظر ہے
تماشا کس قدر دلکش ہُنر ہے

ارے او دیکھنے والے ہنسی سے
نتیجے کی بھی کچھ تجھکو خبر ہے

بڑے آداب ہیں اڑنے میں حائل
محبت بھی بہت بے بال و پر ہے

ابد تک کاش منزل تک نہ پہنچیں
مرا محبوب میرا ہم سفر ہے

پیالا سامنے سے مت ہٹاؤ
کتابِ زندگی پیشِ نظر ہے

مری بربادیوں پر ہنسنے والے

تباہی تک پہنچنا بھی ہنر ہے

یہ دنیا ایک دھوکا ہے نظر کا

حقیقت کچھ نہیں اس کی مگر ہے

جوانی بیش قیمت حادثہ ہے

محبت خوبصورت دردِ سر ہے

جہاں بھی ہے ذرا سی دلفریبی

وہیں رسوا مرا کیفِ نظر ہے

بس اک دو ساعتیں تم اور ٹھہرو

بہت نزدیک ہنگامِ سحر ہے

عدمؔ میں عیب تو بے انتہا ہیں

مگر انساں نہایت بے ضرر ہے

وہ سورج اتنا نزدیک آرہا ہے
مری ہستی کا سایہ جا رہا ہے

خدا کا آسرا تم دے گئے تھے
خدا ہی آج تک کام آرہا ہے

بکھرنا اور پھر اُن گیسوؤں کا
دو عالم پر اندھیرا چھا رہا ہے

جوانی آرزو لے کر کھڑی ہے
بہاروں کو پسینہ آرہا ہے

کچھ ایسے آئی ہے بادِ موافق
کنارا دور ہٹتا جا رہا ہے

غمِ فردا کا استقبال کرنے
خیالِ عہدِ ماضی آرہا ہے

کچھ اس پاکیزگی سے کی ہے توبہ
خیالوں پہ نشا سا چھا رہا ہے

ضرورت ہے کہ بڑھتی جارہی ہے
زمانہ ہے کہ گھٹتا جارہا ہے

ہجومِ تشنگی کی روشنی میں
ضمیرِ میکدہ تھرا رہا ہے

خدا محفوظ رکھے کشتیوں کو
بڑی شدّت کا طوفان آرہا ہے

کوئی پچھلے پہر دریا کنارے
ستاروں کی دھنوں پر گا رہا ہے

ذرا آواز دینا زندگی کو
عدؔم ارشاد کچھ فرما رہا ہے

حال کبھی دل کا ہے ایسا کہ چھپائے نہ بنے
رشک سے جوشِ محبت بھی جتائے نہ بنے

شہرِ انفاس کے جلنے کا قلق ہے لیکن
آگ ہے ایسی مقدّس کہ بجھائے نہ بنے

اس محبت سے عزیزوں نے کیا ہے برباد
اُن کے اخلاص پہ تہمت بھی لگائے نہ بنے

زیست ہو، موسمِ گل ہو کہ مزاجِ خوباں
روٹھ جائے جو اچانک تو منائے نہ بنے

ہے طلب اور تکلّف میں کشاکش جاری
ہاتھ کھینچے نہ بنے ہاتھ بڑھائے نہ بنے

اب ہے احساسِ محبت کی نزاکت کا یہ حال

اس کی تصویر بھی سینے سے لگائے نہ بنے

ایسے ماحول میں ہوتی ہے ملاقات اُن سے

بات کرتے نہ بنے آنکھ ملائے نہ بنے

ہم اگر گیسوئے خوباں سے لپٹ کر سو جائیں

صبحِ محشر سے بھی اے یار جگائے نہ بنے

کاش اُس بزم میں کچھ ایسی مصیبت پڑ جائے

بات جز بندۂ درویش کے جائے نہ بنے

ہائے صیّاد کی کم ظرفیٔ فطرت کا مذاق

رحم کھائے نہ بنے تیر چلائے نہ بنے

آپ نے حال کچھ اس وقت کیا ہے دریافت

حال کا جب کوئی ڈھانچہ ہی بنائے نہ بنے

ہوش سے جا کے ہم آسودہ ہیں اتنے کہ عدمؔ

ہوش میں آنا بھی اب چاہیں تو آئے نہ بنے

کوئی یوں بد دعا فرما گیا تھا
کہ بربادی پہ کچھ پیار آگیا تھا

تمھاری یاد میں اِک آہ بھرلی
دلِ وحشی بہت گھبرا گیا تھا

ہوئی کس طرح برہم بزمِ ہستی؟
اچانک ہوش میں کون آگیا تھا

شکستِ توبہ تفریحاً نہیں کی
مری سرکار بادل چھا گیا تھا

عدمؔ دل کو خدا آباد رکھے
یونہی اک واقعہ یاد آگیا تھا

خرد سے دل کا یارانہ نہیں ہے
کہ اس بستی میں ویرانہ نہیں ہے

مرے دل کو مرا دل ہی سب سمجھے
کسی مفلس کا بیعانہ نہیں ہے

سلوکِ شمع مت فرمایئے گا
مرا اخلاص پروانہ نہیں ہے

کہیں نزدیک میخانہ تو ہوگا؟
کہیں نزدیک میخانہ نہیں ہے؟

زمانے کو پرکھ کر بات کرنا
ہر اک انسان دیوانہ نہیں ہے

بڑی بے لوث الفت کی ہے تم سے
حقیقت ہے یہ افسانہ نہیں ہے

عدمؔ رفتار سے مستی نہ چھلکے
وہ ہستی ہے میخانہ نہیں ہے

غم ہائے روزگار میں وہ دلکشی رہی
دنیا کی ہر خوشی سے ہمیں دشمنی رہی

بے ناخدا ابھی ناؤ کو ہم پار لے گئے
دیکھا نہ کتنی ہوش میں دیوانگی رہی

صرف اک قدم اٹھا تھا غلط راہِ شوق میں
منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈھتی رہی

ایسے خیال آیا کسی کی نگاہ کا!
پیشِ نگاہ جیسے صراحی دھری رہی

ظلمت کا دائرہ جسے کہتے ہیں زندگی
دو چار دن تو اس میں بڑی روشنی رہی

جس رات میں اندھیرے بہت ہی فزوں ہوئے

وہ رات تو ضرور ستاروں بھری رہی

ہر چند جان و دل کی تڑپ تھی نگاہ میں

پھر بھی مشاہدہ میں ذرا سی کمی رہی

میں نے تجھے بہاریں دکھا تھا اے خزاں

میرے خیال میں تری دنیا ہری رہی

شاید مرے خلوص میں کچھ نقص تھا عدمؔ

اُن کو مرے خلوص سے کچھ بدظنی رہی

چلو جانے بھی دو جب ہو گئی ہے
خطائے جنبشِ لب ہو گئی ہے

عبادت تو ہے اک رسمی اطاعت
محبت تجھ سے یارب ہو گئی ہے

تمہاری اک نظر ضائع ہوئی ہے
مری دنیا مرتّب ہو گئی ہے

بس اب زلفِ پریشاں کو سنبھالو
مرا ایمان ہے شب ہو گئی ہے

عدمؔ کچھ اتفاق ایسا ہوا ہے
خموشی عرضِ مطلب ہو گئی ہے

ستم دستور ہوتے جا رہے ہیں

وہ ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں

نقاب الٹی ہے کس زہرہ جبیں نے

اندھیرے نور ہوتے جا رہے ہیں

نہ جانے کیا خطا سرزد ہوئی ہے

خدا مغرور ہوتے جا رہے ہیں

دلوں کو پھول بننے کی ہوس تھی

مگر ناسور ہوتے جا رہے ہیں

خلوص اتنا فراواں ہو گیا ہے

اثر کافور ہوتے جا رہے ہیں

عدمؔ اُن انکھڑیوں کا ذکر سنکر

پیالے چُور ہوتے جا رہے ہیں

کبھی اتنی زحمت تو فرمایئے گا
کہیں سے مجھے ڈھونڈ کر لایئے گا

مرا حال اب کچھ توجہ طلب ہے
مرے حال پر غور فرمایئے گا

بڑا سخت ہے راستہ زندگی کا
ذرا دو قدم آپ بھی آیئے گا

حوادث کی رَو خود بھی اک حادثہ ہے
حوادث کی رو سے نہ گھبرایئے گا

بس اب آنیوالی ہے رُت زندگی کی
کسی دن اچانک چلے آیئے گا

ذرا میں بھی تعظیمِ موسم کروں گا
ذرا آپ بھی شوق فرمایئے گا

یہی آنا جانا تو ہے زندگی میں
کبھی آیئے گا کبھی جایئے گا

اگر طبعِ نازک اہانت نہ سمجھے
مرے جام سے جام ٹکرایئے گا

اگر مے نہ تجویز کی میری خاطر
تو کیا زہر تجویز فرمایئے گا؟

بڑا بے حس و بے ادب ہے زمانہ
بڑی بے رُخی سے گزر جایئے گا

تو کیا دونوں چیزوں سے رغبت نہیں ہے
نہ مے پیجیے گا ، نہ غم کھایئے گا

ہماری گزارش کا اب کیا محل ہے
کبھی خود ہی محسوس فرمایئے گا

نگاہِ خرد اور زعمِ بصارت
جناب عدمؔ ہوش میں آیئے گا

ابر اُٹھ رہے ہیں بادہ گساروں کی شکل میں

بوندیں برس رہی ہیں خماروں کی شکل میں

ہم اس قدر تو ہوش کے دشمن نہ تھے حضور

دھوکے دیئے گئے ہیں بہاروں کی شکل میں

او عشوہ بازِ پھر کوئی ترغیبِ زندگی

انسان بکھر رہے ہیں مزاروں کی شکل میں

کشتی نہ ڈوبتی تو یہ توہینِ لُطف تھی

طوفاں ملے تھے ہم کو کناروں کی شکل میں

وہ رہبروں کے فیض سے کچھ اور بڑھ گئے

جو فاصلے تھے راہ گزاروں کی شکل میں

مت پوچھ خواہشاتِ جوانی کی کیفیت
دو چار ٹھنڈکیں تھیں چناروں کی شکل میں

کتنی جوانیاں تھیں، نگاہوں کے روپ میں
کتنی کہانیاں تھیں اشاروں کی شکل میں

میں اور زندگی سے عدمؔ اتنا ارتباط
آئی تھی نامراد نگاروں کی شکل میں

غم کی کھٹک کو تارِ رگِ جاں بنا دیا
کانٹے کو نرم کرکے گلستاں بنا دیا

کس انگبیں نفس نے گزر کر قریب سے
احساس کو حلاوتِ خنداں بنا دیا

کیا جم تھا اور کیا تھا شکستہ سا اسکا جام
تاریخ نے فقیر کو سلطاں بنا دیا

دنیا ترے وجود کو کرتی رہی تلاش
ہم نے ترے خیال کو یزداں بنا دیا

جس راستے سے ہو کے وہ نکلا غزال چشم
اُس راستے کو شہرِ غزالاں بنا دیا

فرزانگی کی سوچ تحیّر میں گم رہی
دیوانگی نے عالمِ امکاں بنا دیا

کچھ جھوٹ بچ رہا تھا حسینوں کی نوٹ سے
اُس کو کسی نے شیخ کا ایماں بنا دیا

چھوٹی سی ایک لغزشِ مستانہ تھی مری
کاتب نے جس کو دفترِ عصیاں بنا دیا

کیا اور حُسن بخشتے ہم کائنات کو
اُس مہ جبیں کی زلفِ پریشاں بنا دیا

یا رب یہ وقت ہے کہ عطا ہو جدید عُمر
مجھ کو سلوکِ خلق نے انساں بنا دیا

اکثر ترے خیال کی ہلکی سی گونج نے
ہستی کے زیر و بم کو غزلخواں بنا دیا

ہم مشکلاتِ راہ کے ممنون ہیں عدمؔ
رستے کو مشکلات نے آساں بنا دیا

احوالِ زندگی کو لباسِ بہار دے
ساقی معاملات کا چہرہ نکھار دے

توہینِ زندگی ہے کنارے کی جستجو!
منجدھار میں سفینۂ ہستی اُتار دے

پھر دیکھ اس کا رنگ نکھرتا ہے کس طرح
دوشیزۂ خزاں کو خطابِ بہار دے

عمرِ طویل دے کے نہ مجھ کو خراب کر
دو چار جھومتے ہوئے لیل و نہار دے

میں کیسے جان لوں کہ برسنے لگی گھٹا
ساقی ثبوتِ آمدِ ابرِ بہار دے

اک وعدہ اور کر کہ طبیعت پھڑک اُٹھے
اک تیر اور میرے کلیجے میں مار دے

دنیا نے بے شمار عدم کو دیئے ہیں رنج
اے دوست چیز تو بھی کوئی یادگار دے

اے شیخِ باوقار کسی ڈھب سے بات کر
آنکھوں سے بجلیاں نہ گرا لب سے بات، کر

محفل میں گفتگو یہ مسلک نہیں درست
کر تمکنت سے بات مگر سب سے بات کر

ہے ان سے بڑھ کے کون تخاطب کا مستحق
پینے کے وقت انجم و کوکب سے بات کر

لے وہ بکھر گئی ہیں بہاروں کی کاکلیں
اب مہ وشانِ مملکتِ شب سے بات کر

اخلاص سے اگر نہیں گنجائشِ سخن
اے جانِ زندگی کسی مطلب سے بات کر

تو اور تعصّب سے عدم زحمتِ سخن
ظالم کسی نگارِ صدف لب سے بات کر

اے دوست کیا بتائیں کہ کیا کیا نہ ہو سکا
قطرہ بنا بھی موج تو دریا نہ ہو سکا

احباب کا سلوک اگرچہ بُرا نہ تھا
احباب سے سلوک کچھ اچھا نہ ہو سکا

سوجھی تو خوب تھی غمِ امروز کو مگر
دل مبتلائے غمزۂ فردا نہ ہو سکا

رسوائی کے لئے بھی ہے لازم خلوصِ عشق
ہر بوالہوس جہاں میں رسوا نہ ہو سکا

اُس مہ جبیں کے وعدۂ محکم کو دیکھ کر
یوں مٹ گیا یقین کہ پیدا نہ ہو سکا

کشتی بڑے خلوص سے غرقاب ہو گئی
اندازۂ تلاطمِ دریا نہ ہو سکا

اے دوست اختلافِ طبیعت کے باوجود
ہم کو ترا فراق گوارا نہ ہو سکا

میرا مشاہدہ ہے کہ کل وقتِ میکشی
جو حال آپ کا تھا وہ میرا نہ ہو سکا

پھر اک حسین رات عدمؔ یونہی کٹ گئی
سامانِ انبساط مہیّا نہ ہو سکا

اُس چشمِ کیف یار کا احساں بہت نہیں

تاہم یہ ہے کہ قحطِ بہاراں بہت نہیں

مِلتی تو ہے وہ آنکھ پر اُس آنکھ میں ہنوز

مفہومِ اختلاط نمایاں بہت نہیں

آشفتہ ہو گئے ہیں زمانے کے کاروبار

حالانکہ تیری زلف پریشاں بہت نہیں

اب اپنی آگہی سے بھی ہے عشق بے نیاز!

اب آپ کے ملاپ کا امکاں بہت نہیں

کشتی نہ بچ سکی تو عدمؔ ڈوب جائیگی

ویسے خرابِ نیتِ طوفاں بہت نہیں

ذرا سی لطف فرمائی ہوئی ہے

ابھی بدلی کہاں چھائی ہوئی ہے

یہ کیوں ہم کو پریشاں کر رہے ہو

یہ کیا تکلیف فرمائی ہوئی ہے

ٹھہر جا اے خزاں ہم نے گلوں کو

قبائے رنگ پہنائی ہوئی ہے

بڑی گنجائشیں ہیں ڈوبنے کی

جوانی میکدے لائی ہوئی ہے

عدمؔ صرف اپنی نادانی ہے جس نے

ہمیں تکلیف پہنچائی ہوئی ہے

بہاریں ہر چمن میں گلفشاں ہیں
ہماری بستیاں کیوں پُر خزاں ہیں
مآل اندیش جتنے بھی ہیں طائر
گرفتارِ فریبِ آشیاں ہیں
تکلف کرنے والے بولتے ہیں
محبت کرنے والے بے زباں ہیں
جنابِ من کدھر سے آرہے ہو
جبیں پر گلستاں ہی گلستاں ہیں
ادب اے غمزۂ بادِ مخالف
سفینے جانبِ ساحل رواں ہیں

کچھ ایسے ہنس پڑے ہیں زرد غنچے
گماں ہوتا ہے شاید شادماں ہیں

جب اٹھا درد ٹھنڈی آہ بھر لی
جہاں بھی چاند ہیں تسکینِ جاں ہیں

عدمؔ جب سے نہیں آتے اِدھر وہ
اِدھر کے راستے نوحہ کناں ہیں

قرائن حوصلہ افزا نہیں ہیں
وہ ہم پر اب کرم فرما نہیں ہیں

اسیرِ غمزۂ امروز ہیں ہم
خرابِ ماضی و فردا نہیں ہیں

ہے فطری کیفیت اُن انکھڑیوں کی
خمار آلودۂ صہبا نہیں ہیں

ہرے ہوں گے کبھی تو اتفاقاً
نہالِ آرزو صحرا نہیں ہیں

نگاہوں کی جوانی ہنس رہی ہے
نظارے تو بہت زیبا نہیں ہیں

عدمؔ کے حال پر اے بزمِ ہستی!
ترے لطف و کرم کیا کیا نہیں ہیں

میں تجھ سے آشنا سا ہو گیا ہوں

ترا حُسنِ ادا سا ہو گیا ہوں

نشاطِ انتہا کا ذکر سُن کر

خرابِ ابتدا سا ہو گیا ہوں

محبت تو کسی سے بھی نہیں کی

عقیدت سے فنا سا ہو گیا ہوں

چلا تو تھا تقاضے اپنے لے کر

مگر تیری رضا سا ہو گیا ہوں

بسا اوقات اس کی آرزو میں

عدمؔ بے مدّعا سا ہو گیا ہوں

کبھی اُس دلفریبی سے بھی دورِ صُبح و شام آئے
ترے لب زمزمہ چھیڑیں مرے ہاتھوں میں جام آئے

مسیح و خضر کی عمروں سے اُسکا اِک نفس بہتر
وہ انساں جو مصیبت میں کسی انساں کے کام آئے

وہ کاکل اس طرح بکھری بہارِ بے خزاں بن کر
بڑے اخلاص سے اربابِ دانش زیرِ دام آئے

کوئی سوئی ہوئی بجلی گرے دل کے نشیمن پر
کوئی روٹھا ہوا فتنہ برائے انتقام آئے

وہ یوں داخل ہوئے ہیں میری ہستی کے اندھیروں میں
کہ جیسے رات کے آغوش میں ماہِ تمام آئے

قیامت میں ہی اب اُن کا ہمارا فیصلہ ہوگا
جب آئے آہو آنِ بے وفا محشر خرام آئے

عدؔم تشریح ہو گر میرے کفرِ با سلیقہ کی
تو ہر مومن کے لب پر احتراماً میرا نام آئے

وہ آنکھوں سے فسانے کہہ رہے ہیں
گماں ہوتا ہے دریا بہہ رہے ہیں
نہ جانے کس لئے ویران دل میں
وہ اتنی مدّتوں سے رہ رہے ہیں
وہ ایسے کر رہے ہیں بات ہنس کر
کہ جیسے بات سچّی کہہ رہے ہیں
اُمنگوں کی گلابی ندّیوں میں
ستاروں کے سفینے بہہ رہے ہیں

عدمؔ خاموشیاں سر دُھن رہی ہیں
ستارے داستانیں کہہ رہے ہیں

ہمجولیوں کے ساتھ جوانی کی رات تھی
پھولوں کا تذکرہ تھا، ستاروں کی بات تھی

میں نے ہر ایک چیز کو اپنا سمجھ لیا
مجھ کو خبر نہ تھی یہ تری کائنات تھی

کلیوں کے اضطراب سے اڑتا ہے رنگِ گل
پچھلی بہار میں بھی کچھ ایسی ہی بات تھی

اپنا تو زندگی سے تعلق نہ تھا کوئی
تری نگاہ تھی کہ کفیلِ حیات تھی

توبہ کو توڑنا ہی مناسب تھا اے عدمؔ
یاروں کی ٹولیاں تھیں بہاروں کی بات تھی



وہ رات، وہ شبرات وہ برسات کہاں ہے
میں پوچھ رہا ہوں کہ خرابات کہاں ہے

اک بار سرِ بزمِ ازل آپ ملے تھے
فرمائیے اب عزمِ ملاقات کہاں ہے

شب ہوتی ہے رخصت تو نکل آتا ہے سُورج
اتنی بڑی پابندیٔ اوقات کہاں ہے

جو رات کٹی تھی تری زلفوں کے نگر میں
خورشید کے آغوش میں وہ رات کہاں ہے

اِک سادہ سی ہنستی ہوئی بے لوث مروّت
اللہ غنی ایسی مدارات کہاں ہے!

جنت تو صِلا ہے مری مزدوری کا یارب
اس میں ترے فیضان کی سوغات کہاں ہے
ساقی مری ہستی کا چمن سوکھ گیا ہے
ساقی ترے الطاف کی برسات کہاں ہے

جب میں نہیں ہوتا تو عدمؔ کہتا ہے ساقی
اے بادہ کشو مردِ خرابات کہاں ہے

وہ جاتے جاتے ہنس کے جو اک بات کر گئے

دورِ زماں کو دورِ خرابات کر گئے

ڈالی نظر تو روحِ خرابات بخش دی

کی گفتگو تو بارشِ نغمات کر گئے

ہم نے متاعِ زیست کو ضائع نہیں کیا

دو چار روز سیرِ خرابات کر گئے

آئے تھے مجھ سے ملنے مگر میں نہ جب ملا

وہ میری بے خودی سے ملاقات کر گئے

میں عمر بھر عدمؔ نہ کوئی دے سکا جواب

وہ اک نظر میں اتنے سوالات کر گئے !

افسانہ چاہتے تھے وہ، افسانہ بن گیا
میں حُسنِ اتفاق سے دیوانہ بن گیا

جو زلف منتشر ہوئی زنجیر بن گئی
جو حرف مختصر ہوا، افسانہ بن گیا

بننے میں کتنے مرحلے ہوتے ہیں رونما
دل کعبہ بنتے بنتے پری خانہ بن گیا

دیوانگی کی شرط کچھ اتنی عجیب تھی
جس میں ذرا سی عقل تھی فرزانہ بن گیا

حیرت مجھے بھی ہے مگر او چشمِ باخبر!
کچھ تو ضرور ہوگا جو افسانہ بن گیا

سُن سُن کے رشک سے میرے حالات اے عدمؔ
جو صاحبِ خرد تھا وہ دیوانہ بن گیا

نہ تھی وسعت تو اتنی آستیں کی
نہیں پھر بھی کسی سے بھی نہیں کی

اُٹھی چوکھٹ پہ گرنا چاہتی ہے
تمنا دیکھنا میری جبیں کی

اسی رستے سے کچھ مل جائے شاید
پرستش کر رہا ہوں اک حسیں کی

مجھے بہکانے آئی ہے تو دُنیا
پرے ہٹ بے ادب جاہل کہیں کی

چلے آؤ دلاسے دینے والو
بڑی ویران ہے دُنیا یقیں کی

قیامت نام جس کا رکھ دیا ہے
کھٹک ہے اِک نگاہِ شرمگیں کی

گئی تھی یاد میری اُس گلی میں
ستمگر ہو رہی جا کر وہیں کی

عدمؔ دنیا کی کیا اوقات پیارے
یہ اِک تخلیق ہے اپنے یقیں کی

ہے عقل یوں ہراس وگماں سے بھری ہوئی

جیسے ہرن کی آنکھ ازل سے ڈری ہوئی

جانے تری نگاہ نے سمجھا تھا کیا اُسے

دل خوں کی ایک بوند تھی وہ بھی مری ہوئی

ہے زیست اِک بسیط خلا، جسکے اُس طرف

پھولوں کے تخت پر ہے صُراحی دھری ہوئی

انسانیت سے جس نے بشر کو گرا دیا!

یارب وہ بندگی ہوئی یا ابتری ہوئی

دل میں تو خوں کا ایک بھی قطرہ نہ تھا عدمؔ

ہے نوکِ خار کس کے لہو سے بھری ہوئی

میں نے خرد کو راغبِ پیمانہ کر دیا
دشمن کو کس خلوص سے دیوانہ کر دیا

ہنس ہنس کے دو جہان کا غم ہم نے لے لیا
لے کر سپردِ شیشہ و پیمانہ کر دیا

میں نے تو بات کی تھی تفنن کے رنگ میں
تم نے تو کھینچ کر اسے افسانہ کر دیا

وہ آج آ گئے تھے خدائی کے وہم میں
ہم نے بھی ایک سجدۂ شکرانہ کر دیا

تھوڑی سی عقل لائے تھے ہم بھی مگر عدم
دنیا کے حادثات نے دیوانہ کر دیا

زحمتِ اعتنا نہ فرماؤ

ظلم کی انتہا نہ فرماؤ

ناؤ لگ جائے گی کنارے پر

منّتِ ناخدا نہ فرماؤ

اختلافات ہو ہی جاتے ہیں

جانِ من فیصلا نہ فرماؤ

یہ اہانت ہے آدمیّت کی

اے رفیقو دُعا نہ فرماؤ

ایسی لغزش خدا نہ بخشے گا

ایسی مہلک خطا نہ فرماؤ

آدمی ہو، خدا کی نعمت ہو

نعمتوں کو قضا نہ فرماؤ

وہ خدا ہے تو آپ سُن لے گا

اے عدمؔ التجا نہ فرماؤ

طوافِ گردشِ مے کر رہے ہیں
حوادث راستہ طے کر رہے ہیں

وہ میری روح کو تادیب دیکر
مری ہستی کو لاشے کر رہے ہیں

بہار اب آگئی ہو گی یقیناً
کہ بُلبُل نالۂ نے کر رہے ہیں

انہیں دشمن کہوں یا دوست سمجھوں
جو اُن کو میرے درپے کر رہے ہیں

عدمؔ کیوں معترض ہیں لوگ ہم پر
بتائیں بھی تو ہم کیا کر رہے ہیں

خرد کی انتہا ہے اور میں ہوں
جنوں کی ابتدا ہے اور میں ہوں

عجب روٹھا ہوا ساتھی ملا ہے
دلِ بے مدّعا ہے اور میں ہوں

کوئی لغزش نہ ہو جائے اچانک
ترا بندِ قبا ہے اور میں ہوں

زمانہ درمیاں سے ہٹ گیا ہے
جمالِ آشنا ہے اور میں ہوں

وہاں پہنچی ہے نوبت بیکسی کی
جہاں نام خدا ہے اور میں ہوں

کہیں جھوٹے پڑے ہیں اور وہ ہیں

کہیں محشر بپا ہے اور میں ہوں

عدم کشتی کے اندر دو خلل ہیں
سکوتِ ناخدا ہے اور میں ہوں

ہو گئی اُن سے پیار کی بات

بن گئے کچھ اسبابِ حیات

سوچ کے دیں گے اُسکا جواب

سن بیٹھے ہیں آپ کی بات

اپنی طبیعت کا لہراؤ

اس کے سوا دجلہ نہ فرات

قطعِ تعلق مت کیجئے

ڈوب نہ جائے نبضِ حیات

کتنی جلدی صُبح ہوئی

کتنی طولانی تھی رات

توبہ سستی بکتی ہے

اِک انگڑائی اِک برسات

اور بھی کچھ باقی ہے عدمؔ
بھول گئے ہو کل کی بات

برنگِ صورتِ پروانہ جل گیا ہوں میں
بڑے وقار سے شاہانہ جل گیا ہوں میں

لگا کے لب میں اسے کیا کروں گا اے ساقی
اٹھا کے ہاتھ میں پیمانہ جل گیا ہوں میں

نسیمِ کوچۂ دلدار اب چلے نہ چلے
مثال سبزۂ بیگانہ جل گیا ہوں میں

صنم کدے میں بھی نمرود کی خدائی تھی
بہ زیرِ سایۂ بتخانہ جل گیا ہوں میں

نہ دیکھ بارِ مکرر مجھے محبت سے
خدا کے واسطے جانانہ جل گیا ہوں میں

بڑی فراخدلی سے کیا ہے عشق عدمؔ
بغیر صحبتِ جانانہ جل گیا ہوں میں

میخانۂ حیات کا جب باب کُھل گیا

ہر سمت اِک دریچۂ شاداب کُھل گیا

اس دلکشی سے دوش پہ بکھریں وہ کاکلیں

تھوڑا سا رنگِ انجم و ماہتاب کُھل گیا

نظریں کچھ اس طرح سے ملیں پہلی مرتبہ

جیسے کہانیوں کا کوئی باب کُھل گیا

اُس چشمِ مہرباں کے تعاون کی دیر تھی

کتنا بڑا ذخیرۂ اسباب کُھل گیا

کس حوصلے سے ہم نے کیا ضبط اے عدمؔ

کس سادگی سے پردۂ احباب کُھل گیا

نشاطِ دل ہے یا تسکینِ جاں ہے
مری ہر شے برائے دوستاں ہے
یہاں اخلاص بھی اِک مصلحت ہے
یہ دنیا عالمِ سود و زیاں ہے
سماعت کو ذرا تکلیف دیجئے
سکوتِ لالہ و گل نغمہ خواں ہے
حیاتِ جاوداں کیا چیز ہوگی
حیاتِ عارضی بھی جاوداں ہے
عمل اور سوچ میں ہے فرق کتنا !
کنارا چپ ہے اور دریا رواں ہے
عدم ہستی کے اُجڑے گلستاں میں
محبت ہی بہارِ بے خزاں ہے

اے دوست وہ جو تیری جدائی کی بات تھی
واللہ اِک شدید دہائی کی بات تھی
دستِ دعا اٹھا تھا کہ ناگاہ گر گیا!
اس شرم سے کہ وہ تو گدائی کی بات تھی
تو میرا غمگسار نہ بنتا تو ٹھیک تھا
اے غمگسار تیری بھلائی کی بات تھی
نکلے بغیرِ جُرم جو ہم باغِ خلد سے
واللہ احترامِ خدائی کی بات تھی
جس نے خزاں کو حرفِ ندامت بنا دیا
اُس کی اُداس اُداس جمائی کی بات تھی
جس سے عدم دیارِ چمن جگمگا اٹھا
اس مہ جبیں کے دست حنائی کی بات تھی

خرد بھی برگزیدہ ہو گئی ہے
جنوں کی ہم عقیدہ ہو گئی ہے

تمہاری بیکراں ہمدردیوں سے
محبت آبدیدہ ہو گئی ہے

فراست موسمِ گل تک پہنچکر
گریبانِ دریدہ ہو گئی ہے

چمن کا بوجھ اُس نے سہہ لیا ہے
وہ ٹہنی جو خمیدہ ہو گئی ہے

بہار آئی تو تھی لیکن اچانک
گناہِ ناچشیدہ ہو گئی ہے

عدمؔ کیا رنج اب اُس بات کا جو
پیامِ نارسیدہ ہو گئی ہے

میں کبھی نادم نہ ہوا، وہ کبھی پشیماں نہ ہوا!

فائدہ کچھ نہ ہوا تو، کوئی نقصاں نہ ہوا!

ایک ہی بار تری شکل کا عرفاں تھا محال

دوسری بار کوئی آئنہ حیراں نہ ہوا!

آہ، وہ عزتِ ہستی جو رہی اپنی اسیر،

ہائے وہ قطرہ جو منّت کشِ طوفاں نہ ہوا

دل کی تکلیف کے درماں تو بہت تھے لیکن

میں کسی آنکھ کا شرمندۂ احساں نہ ہوا

کون سی آس تھی بر آئی جو ہستی میں عدم

کون سا خواب تھا، جو خوابِ پریشاں نہ ہوا

بس اور اتنا کرم سرکار کردو

ستم کرنے سے بھی انکار کردو

سفر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے

مرے رستے کو کچھ دشوار کردو

سفینے اب یونہی چلتے رہیں گے

تلاطم ہی کو اب پتوار کردو

شفا کی سب سے بہتر شکل ہے یہ

حریصِ لذّتِ آزار کردو

خرد ہے گر دلیلِ تندرستی

تو ہر انسان کو بیمار کردو

عدمؔ تک زندگی لہرا اُٹھے گی

کسی اُمید کو بیدار کردو

فریبِ دوستی تو کھا گیا ہوں
مگر کچھ تیرے نزدیک آ گیا ہوں
بڑی تعجیل سے لب ہل گئے تھے
بڑی تاخیر سے سمجھا گیا ہوں
خموشی کو بنا کر حرفِ مطلب
حکایت کو بہت پھیلا گیا ہوں
تم اپنے جھوٹ کو نادم نہ کرنا
میں اپنے صدق سے شرما گیا ہوں
برونِ آئنہ وہ خود کھڑے ہیں
درونِ آئنہ میں آ گیا ہوں

کوئی کارِ فراست تو ہوا ہے
کسی ترغیب میں تو آ گیا ہوں
عدمؔ یاد ہ مجھے دم دے گئے ہیں
نہیں تو میں اُنھیں بہکا گیا ہوں

۴۵۵

یہ کیا نقشے پیالوں پر پڑے ہیں
بڑے چھینٹے خیالوں پر پڑے ہیں

نگاہیں چور ہیں، نیندوں سے اُن کی!
گھنیرے بال گالوں پر پڑے ہیں

تمھاری انکھڑیوں کے زخم خوردہ
تمہارے اندمالوں پر پڑے ہیں

نگاہِ ہوش کیا، افشا کرے گی
بڑے پردے جمالوں پر پڑے ہیں

جواب، اُن ہی کے مانگے تھے عدمؔ نے
نشان جن جن سوالوں پر پڑے ہیں

باتیں تو سن رہا تھا مگر یوں خموش تھا

جیسے میرا کلام اُسے بارِ گوش تھا

نادان عقل ہوش کے کانٹے خرید لائی

حالانکہ طِفلِ عشق تبسّم فروش تھا

ساقی نہ پوچھ کس طرح پہنچے ترے حضور

رستے میں اِک طویل بیابانِ ہوش تھا

کِس بے تکلّفی سے اُڑا ہے گُلوں کا رنگ

شاید یہ قافلہ بھی اثاثہ بدوش تھا

جس کو خبر نہ تھی وہ عدمؔ تھا ہمہ خروش

جس کو ذرا سا علم تھا، یکسر خموش تھا

نکلی ہے فالِ اہلِ خرد کی کتاب سے

اک جام قیمتی ہے جہانِ خراب سے

کرتا نہ بھول کر کبھی گستاخیٔ سوال

ہوتا جو آشنا میں تمہارے جواب سے

زُلفیں بکھیر دے کہ زمانے کو علم ہو

ظُلمت حسین تر ہے، شبِ ماہتاب سے

پہلی نگاہِ شوق کی وارفتگی نہ پوچھ

نغمے کی لہر جیسے رواں ہو رباب سے

دیکھا ہے جب سے ان کی نگاہوں کو اے عدمؔ

مانوس ہو گئی ہے طبیعت شراب سے

تکلیف میں جو لب پہ ترا نام آگیا
کچھ درد بڑھ گیا، ذرا آرام آگیا

میں جا رہا تھا تیرے تصوّر کیساتھ ساتھ
رستے میں یونہی عالمِ اجسام آگیا

ہم کو تو مَے کے باب میں صرف اتنا علم ہے
جب بھی مطالبہ کیا اِک جام آگیا

پوچھا تھا ایک صاحبِ دل نے مرا مزاج،
بے ساختہ لبوں پہ ترا نام آگیا

ہم نے تمھارے بعد نہ رکھی کسی سے آس
اِک تجربہ بہت تھا بڑے کام آگیا

اے کاش، جھوٹ ہی کوئی آکہ کہے مجھے
اُٹھ بھی عدمؔ کہ ساقیٔ گلفام آگیا

زندہ دلی کو کثرتِ افکار کھا گئی
بُنیاد کے غرور کو دیوار کھا گئی

غائب ہے میرا نامۂ اعمال حشر میں
رحمت تری متاعِ گنہگار کھا گئی

کتنے حسین تھے غمِ ہستی کے شعبدے
جو چشمِ باخبر تھی وہی مار کھا گئی

کس درجہ بد لحاظ تھی منحوس زندگی
ہر ہمدمِ عزیز کو مُردار کھا گئی

رکھتے تھے ہم بھی جنسِ دلِ بے بہا عدمؔ
لیکن اُسے نگاہِ خریدار کھا گئی

بڑے جوش پر موسمِ رنگ و بُو ہے
مگر گُلستاں میں نہ میں ہوں نہ تُو ہے
زمانے کی مصروفیت تھم گئی ہے
وہ بیٹھے ہیں اور آئنہ روبرُو ہے
حقیقت نہ کُھل جائے بیگانگی کی
تری آنکھ آمادہ گُفتگو ہے
ہمیں بھی چبھو دیجئے کوئی کانٹا
ہمیں بھی کسی پھول کی جُستجو ہے

عدؔم زندگی کے سِتم آپ کم ہیں
تجھے اور کس چیز کی آرزُو ہے

مجھ کو تیری ڈگر پر چلنے سے تو کچھ انکار نہیں

لیکن اتنا یاد رہے یہ پھولوں کا بیوپار نہیں

میں تو اسی کو ٹھیک کہوں گا جسکو تم نے ٹھیک کہا

میرے کہے پر کان نہ دھرنا میں اتنا ہشیار نہیں

ذوقِ سفر کی خاطر پہلا درس ہے یہ آگاہی کا

جو رستہ دشوار نہیں ہے وہ رستہ ہموار نہیں

آہی گئے پھر آپ یہ لوگوں سے سنکر بیمار ہیں ہم

آپ کا آنا سر آنکھوں پر لیکن ہم بیمار نہیں

آج نہ جانے اتنی جرأت کیسے علامؔ میں در آئی

اس نے کہا پی میری خاطر، اُسنے کہا سرکار نہیں

ابھی نکہتوں سے بھرا ہے اندھیرا

بڑی دیر کے بعد ہوگا سویرا

چلے گا بھلا تیرے کہنے پہ کیسے

ارے ناخدا یہ سفینہ ہے میرا

یہاں میں بھی مہمان تو بھی مسافر

یہ بے فیض گلشن نہ تیرا، نہ میرا

بڑی بے رخی سے ملے وہ چمن میں

نہ آنکھیں ملائیں، نہ گیسو بکھیرا

زمانے کے اطوار سے تنگ آکر

عدمؔ کر لیا میکدے میں بسیرا

جیسے ماہِ تمام دیتے ہیں

کس محبت سے جام دیتے ہیں

ان کو ملتے ہوئے لرزتا ہوں

جو حیاتِ دوام دیتے ہیں

اے غمِ زیست آ تجھے کوئی

خوبصورت سا کام دیتے ہیں

جس کو رکھنا ہو باخبر اس کو

زخم بالالتزام دیتے ہیں

مجھ کو آلامِ زندگی کے عدمؔ

زندگی کا پیام دیتے ہیں

شگفتہ شگفتہ ، سُہانے سہانے

کہاں جا بسے وہ مقدس زمانے

گرے جب بھی میخوار سجدے میں پی کر

ستاروں سے ٹکرا گئے بادہ خانے

چلو خیر اب ذکر کیا ان ضدوں کا

نہ ہم لوگ مانے ، نہ تم لوگ مانے

نہ پوچھو یہ صوفی منش لوگ شب کو

کہاں جا رہے ہیں وضو کے بہانے

یہ کس رنگ کی گردشیں کھا رہا ہے

ارے او ، زمانے ، ارے او زمانے

کہاں راستہ دیکھتے بجلیوں کا

بہار آئی اور جل گئے آشیانے

عدمؔ فصلِ گُل ہو کہ عہد جوانی

بڑا لُطف دیتے ہیں رنگیں فسانے !

یہ اسرار رندوں کے توڑے ہوئے ہیں
ترے نین بھی آج ڈوبے ہوئے ہیں

نہ جانا چمن میں کہ اہلِ چمن نے
مہکتے ہوئے دام کھولے ہوئے ہیں

تمہیں جن کی باتوں پہ اتنا یقیں ہے
یہ سب لوگ میرے ٹٹولے ہوئے ہیں

خدا ہے جو ہم بیکسوں کو بچائے
بڑا بول اغیار بولے ہوئے ہیں

عدمؔ غرقِ مستی ہے اور زندگی نے
مصائب کے دیوان کھولے ہوئے ہیں

صُراحی میں گلرنگ پانی نہیں ہے
تلاطم نہیں ہے روانی نہیں ہے

نصیحت بڑی قیمتی شئے ہے ناصح
مگر یہ علاجِ جوانی نہیں ہے

دلِ مُضطرب عہد گُل میں نہ مرنا
ہمیں فرصتِ نوحہ خوانی نہیں ہے

زمانے کی رعنائیوں پہ نہ جانا
کوئی چیز اتنی پرانی نہیں ہے

ستارے ہیں اترے ہوئے میکدے میں
عدمؔ واقعہ ہے کہانی نہیں ہے

بے کیفیٔ حیات میں کیوں مل گئے ہو تم
ایسی سیاہ رات میں کیوں مل گئے ہو تم

میں حادثاتِ زیست پہ کچھ کر رہا تھا غور
آشوبِ حادثات میں کیوں مل گئے ہو تم

تم سے تو راہِ صدق میں ملنے کا قول تھا
راہِ تکلفات میں کیوں مل گئے ہو تم

اُس سرمدی حیات میں ملتے تو بات تھی
اِس عارضی حیات میں کیوں مل گئے ہو تم

ملتے فراغتوں میں عدم کی تو بات تھی
دورِ تفکرات میں کیوں مل گئے ہو تم

ہر شخص سے رہ بس کے مری جاں کلام کر
میرا نہیں تو اپنا ہی احترام کر

جیسے کہ ہاتھ میں نے دو عالم پہ رکھ دیا
محسوس یوں ہوا ترے دامن کو تھام کر

جاتا کہاں ہے اے غمِ دوراں اُداس اُداس
آ میرے مہرباں مرے دل میں قیام کر

ساقی تری نظر کے بڑے اختیار ہیں
میرے لئے تو آپ ہی کچھ انتظام کر

پھولوں کی نکہتیں ہوں پیالوں کے زمزمے
پھر میں کہوں کسی سے "مری جاں خرام کر"

دن تو کسی طرح سے نکل ہی گیا عدمؔ !
شام آ رہی ہے، مردِ خدا فکرِ شام کر

ہوش کا جو بھی خار تھا برگِ گلاب ہوگیا

جس پہ تری نظر پڑی، غرق شراب ہوگیا

طور پہ ہی گئے تھے ہم آپ کو ڈھونڈنے مگر

کثرتِ احتیاط سے کام خراب ہوگیا

دو ہی تو لفظ تھے فقط دفترِ کائنات میں

عقل سوال بن گئی، عشق جواب ہوگیا

چشمِ کرم تو ایک تھی ظرف کے اختلاف سے

کوئی درست ہوگیا کوئی خراب ہوگیا

میکدہ عدم میں ہی چل کے پئیں گے اب فقیر

میکدہ حیات میں قحطِ شراب ہوگیا

حیراں نہیں ہوں سلسلۂ حادثات پر
میں غور کر رہا ہوں کسی اور بات پر

جب سے ہوا ہے اسکی نگاہوں کا کچھ کرم
جوبن سا آگیا ہے ذرا واقعات پر

جینا ہے چار روز تو اے صاحبِ خرد
گہری نظر نہ ڈال فریب حیات پر

ممکن ہے تری بات سراسر درست ہو
مجھ کو تو اعتبار نہیں تری بات پر

غلطاں تھی کائنات اسی رنگ میں عدمؔ
جس رنگ کی نگاہ پڑی کائنات پر

جینے کے لئے ارمانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے

پینے کے لئے پیمانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے

ایسا بھی کبھی ہو جاتا ہے آپ ایسے امیر انسانوں کو

ہم ایسے غریب انسانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے

جب شمع فروزاں ہو تنہا، ماحول فسردہ ہوتا ہے

رونق کے لئے پروانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے

ہر شخص حقائق کی تلخی سے اتنا پریشاں ہوتا ہے

ہر شخص کو کچھ افسانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے

جس موسم میں در آتے ہیں ہر گھر میں عدم سے دیوانے

اس موسم میں دربانوں کی سرکار ضرورت پڑتی ہے

